الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

مئی 2010

مبارک حسین مصباحی

ملت کے نام حضرت عزیز ملت کا پیغام

حضرات گرامی .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ آج اسلام وسنیت کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے اور ہر محاذ پر مقابلہ کے لیے ماہر ومعتبر علما کی جماعت ضروری ہے اور ایسے ماہرین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی شعبوں کو مزید آگے بڑھائیں اور فضیلت سے فارغ ہونے والے علما کے لیے تحقیق اور مطالعہ کے کچھ ایسے تربیتی شعبے قائم کریں جن میں اسلام وسنیت کے ساتھ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت، قادیانیت، رافضیت وغیرہ پر گہری نظر رکھنے والے الگ الگ گروپ تیار ہوں، جو تقریری وتحریری طور سے باطل کا جواب دے سکیں اور ان میں بھی الگ الگ ممالک اور مختلف زبانوں کے لحاظ سے افراد تیار ہوں، جو بیرون ملک بھی اسلام وسنیت کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں، اسی طرح پیدا شدہ حالات کی روشنی میں نئے نئے فقہی سوالات بھی جنم لے رہے ہیں، جن کے حل کے لیے ماہر فقہا ومفتیان کی تخریج ضروری ہے، جب کہ ابتدائی فارسی وعربی سے عالم وفاضل تک کے کورس کو مزید مستحکم ونتیجہ خیز بنانے اور زیادہ سے زیادہ اچھے افراد پیدا کرنے کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ نصاب کی اصلاح اور نئی کتابوں کی تیاری کے لیے بھی تجربہ کار اہلِ قلم کا ایک بورڈ ضروری ہے۔ ادارے کو اسلامی یونیورسٹی کی شکل دینے کے لیے کالج کی سطح کے مختلف شعبوں کا قیام اور ان کا معقول انتظام بھی ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے مختلف اسباب ووسائل کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ سرمایہ کی فراہمی کا بھی ہے، کیوں کہ ہماری سرپرستی کے لیے کوئی حکومت نہیں ہے جو دینی منصوبوں کی روشنی میں مصارف کا انتظام کرے۔ ہماری ضروریات غریب مسلمانوں اور قوم کے اہلِ خیر حضرات ہی سے پوری ہوتی ہے۔ ادارہ کے پھیلاؤ اور تعلیمی وتعمیری ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر اہلِ خیر حضرات کی مزید توجہ اور اعانت کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے لیے بعض اہلِ خیر نے یہ تجویز رکھی ہے کہ پورے ملک سے دس ہزار ایسے ممبر بنائے جائیں جو کم از کم ایک بار گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے کا تعاون پیش کریں اور ادارہ ان کو اعزازی رکنیت کی سند بھی عطا کرے۔ اگر اس مطلوبہ تعداد میں ممبر سازی مکمل ہو جاتی ہے تو اگلے بہت سے منصوبوں کی تکمیل آسان ہو جائے گی۔

اس تجویز کی روشنی میں ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ دین کے فروغ واستحکام اور قوم مسلم کی سربلندی کے لیے آپ خود بھی مخلصانہ قدم بڑھائیں اور اپنے احباب ومتعلقین کو بھی تیار کریں اور ایسے حضرات کی نشان دہی فرمائیں جن کو اس کارِ خیر میں شریک کیا جا سکے۔ امید ہے کہ آپ رکنیت فارم پُر کرنے کے ساتھ اپنی رقم گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے (Rs. 11,111) دستی یا الجامعۃ الاشرفیہ (Al-Jamiatul, Ashrafia) کے نام ڈرافٹ بنوا کر بہت جلد ارسال فرمائیں گے اور دوسرے ایسے اہل سنت کے پتے بھی فراہم کریں گے جن سے رابطہ کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دارین کی سعادتوں سے نوازے اور دینی کاموں میں حصہ لینے کی پوری توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی مصیبت و پریشانی سے محفوظ ومامون رکھے، آمین۔

رابطے کا پتہ: مجلسِ تعمیر وترقی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ۔ (یو. پی.)

از: عبد الحفیظ عفی عنہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور

زیرِ سرپرستی

عزیز ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبد الحفیظ صاحب قبلہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ | مئی ۲۰۱۰ء | جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۵

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ	THE ASHRAFIA MONTHLY	قیمت عام شمارہ: 15 روپے
دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴	Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404	سالانہ: 150 روپے
چیک اور ڈرافٹ بنام **مدرسہ اشرفیہ** بنوائیں	کوڈ نمبر ——— 05462 دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149 الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092 دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122	سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ 500 روپے دیگر بیرونی ممالک 20 $ امریکی ڈالر 15 £ پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

نقوشِ قلم

اب تک زن، زر، زمین کے نام پر جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان بھی انسانی دنیا کی اولین ترجیح رہی ہے۔ مگر اکیسویں صدی عیسوی کا سب سے حساس مسئلہ پانی ہوگا۔ گلوبل وارمنگ کا یہ خدشہ اب یقین کی منزل میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اکیسویں صدی کی عالمی جنگ اگر ہوئی تو صاف پانی کے مسئلہ پر ہوگی۔ درجۂ حرارت میں اضافہ اور کاربن کے اخراج کے بڑھنے سے عالمِ انسانیت کا کارواں خطرے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ انڈین قومی کمیونی کیشن نے فضائی حبس تمازت کے اثرات سے متعلق ابتدائی تجربہ ۲۰۰۴ء میں موسمیاتی تبدیلی پر اقوام متحدہ فریم ورک کنونشن کو پیش کیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں بارش کی مقدار اور حرارت میں اضافہ ہوگا۔ رپورٹ مختلف دریاؤں میں بہتے پانی کی کمی، خشکی اور ملک کے مختلف حصوں میں سیلاب کے اضافے کی نشان دہی کرتی ہے۔ بین الحکومتی پینل جو سائنس دانوں اور ماہرین پر مشتمل ہے نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ ۱۹۸۵ء سے لے کر کل زمینی سطح کی حرارت کے آلات و اوزار کے ریکارڈ میں گزشتہ بارہ سال میں سے ۱۱ر سال سب سے زیادہ گرمی کے سال دیکھے گئے ہیں۔ اس رپورٹ میں ہندوستان کے تعلق سے کسی خاص خدشے کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ لیکن ماہرین نے اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ عالمی موسم کی تبدیلی اور ضرر رسانی سے پانی کی قلت والے علاقوں میں پانی کی کمی میں زیادہ شدت پیدا ہوگی۔

۱۲ر جنوری کو اسلام آباد میں ہونے والی ایک کانفرنس میں ڈاکٹر راجندر کمار پاچوری (جو آئی. پی. سی. سی. کے چیرمین بھی ہیں اور امریکہ کے سابق وائس پریسیڈینٹ الگور کے ساتھ امن کا نوبل انعام حاصل کر چکے ہیں) نے کہا کہ پاکستان اس وقت بڑی تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، پاکستان میں پانی کے مسائل اس وقت بھی گمبھیر ہیں لیکن مستقبل میں پانی کا حصول دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آب و ہوا کی تبدیلی سے سمندری پٹی پر واقع علاقے زیرِ آب آجائیں گے۔

اس وقت ہندوستان میں بھی پانی کی قلت کا سخت مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ کم پانی والے علاقوں میں بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بلکہ بہت سے علاقوں میں زیر زمین پانی میں زہریلے اثرات پیدا ہو گئے ہیں۔ وزارت آبی وسائل کی ایک رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے کہ اتر پردیش سمیت ملک کی بیش تر ریاستوں میں زیر زمین موجود پانی میں زہریلے کیمیکلز موجود ہیں جن کے سبب یہ پانی پینے کے لائق نہیں رہا ہے اور صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق اندھا دھند صنعت کاری اور شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب حالات خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں اور اگر جلد ہی اس سلسلے میں سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تو وہ دن دور نہیں جب عوام کو پینے کے لائق صاف پانی بھی نہیں مل پائے گا۔ پانی میں گھلتے ہوئے زہر کے تعلق سے وزارت آبی وسائل نے جو رپورٹ دی ہے وہ ان تمام خدشات کی بڑی حد تک تصدیق کرتی ہے جو اس سے قبل مختلف سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں، اداروں اور ماہرین کی طرف سے ظاہر کیے جاتے رہے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں اس وقت کے امریکی سینیٹر گیلارڈ نیلسن نے امریکہ میں ہر برس ۲۲ر اپریل کو ارتھ ڈے منانے کا آغاز کیا تھا۔ یہ سلسلہ دوسرے ملکوں میں بھی بڑھتا رہا اور آج دنیا کے ۱۷۵ر ملکوں میں یوم ارض منایا جاتا ہے۔ دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے یوم ارض کے موقع پر اپنی ایک تحریر میں بڑی اچھی بات کہی: "ہم دھرتی ماں کے ساتھ من مانی کرنا جتنی جلدی ہو سکے بند کر دیں ہم سب کی بھلائی اسی میں ہے۔" بلا شبہہ سچائی یہی ہے کہ آج پوری دنیا گلوبل وارمنگ کے جس سنگین مسئلے سے دوچار ہے، یہ مسئلہ خود انسان ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ آپ

گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں اضافے سے متعلق اعداد و شمار سے بھی لگا سکتے ہیں۔ ہم نے ٹرانس پورٹ، صنعت کاری، زراعت اور نئی عمارتوں کی تعمیر میں، برق رفتاری کی دوڑ میں انسانی زندگی کا سکون غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ عہدِ حاضر کا انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان تیار کر رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کی اس فکر کے عین مخالف ہے:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ۔ (البقرۃ: ۱۹۵) اپنے ہاتھوں خود کو تباہی میں نہ ڈالو۔

ملک کے مختلف علاقوں میں پانی کے لیے ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ پانی کی قلت کا جو مسئلہ شمالی ہندوستان میں درپیش ہے، اب وہی صورت حال جنوبی ہند کی ریاست کرناٹک میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کرناٹک کے ۱۷۸ر میں سے ۱۲۴ربلاک ڈارک زون کی گرفت میں آچکے ہیں اور ۲۹ر میں سے ۱۹ر اضلاع میں پانی کی قلت نے بہت نازک صورتِ حال اختیار کرلی ہے۔ جیسے جیسے گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے پانی کی سطح بھی نیچے جا رہی ہے۔ انسانوں کے ساتھ چرند پرند بھی بے حال ہو رہے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے تو حضرت انسان اس کی قدر و قیمت نہیں سمجھتا لیکن جب وہ دائرہ تنگ فرما دیتا ہے تو ہر طرف اضطراب اور بے چینی شروع ہو جاتی ہے اور اس کی نعمت کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پانی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ پانی ہی سے اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو وجود بخشا اور پانی ہی کے ذریعہ کاروانِ حیات رواں دواں رہتا ہے۔ پانی کی قلت صرف ایک پانی کا مسئلہ نہیں بلکہ پانی کی کمی سے پورا کاروبارِ حیات دم توڑنے لگتا ہے۔ قرآن عظیم نے پانی کی اہمیت کا فلسفہ اس وقت دنیا کے سامنے پیش کیا تھا جب موجودہ سائنسی تجربات کا وجود نہیں تھا۔ ماہرین آج دنیا کو پانی کے متوازن خرچ کا مشورہ دے رہے ہیں۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے پانی کے اسراف پر تنقید فرمائی تھی۔ حیات و کائنات میں پانی کی بنیادی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن عظیم فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ (الانبیاء: ۳۰ / ۱۷) ترجمہ: اور ہم نے ہر جان دار چیز پانی سے بنائی۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر قرآن کا ارشادِ ناطق ہے:

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَاءٍ۔ (النور: ۴۵ / ۱۸) ترجمہ: اور اللہ نے زمین پر چلنے والے ہر جان دار کو پانی سے پیدا کیا۔

یہ فرحت بخش اور شیریں پانی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ وہ جب چاہے اسے کھاری کر دے اور جب چاہے ابلتے چشمے خشک کر دے۔

قرآن عظیم ہماری ناشکری اور حق ناشناسی کے پندار پر ضرب کاری لگاتا ہوا ارشاد فرماتا ہے:

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ. أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ. لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ.(الواقعۃ: ۵۶ / ۷۰)

تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو، کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں پھر کیوں نہیں شکر کرتے۔

پانی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، ہر جان دار اور بے جان کا انحصار اور مدار پانی پر ہے، جس وقت کچھ نہیں تھا اس وقت بھی پانی تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ۔ (سورہ ھود: ۷ / ۱۱) ترجمہ: اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

پانی کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ انسانی جسم کا دو تہائی حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ ایک عام انسان کے جسم میں ۳۵ر لیٹر سے لے کر ۵۰ر لیٹر تک پانی ہوتا ہے۔ صرف دماغ کا ۸۵ر فی صد حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ انفیکشن سے لڑنے والے محافظ خلیے خون میں سفر کرتے ہیں، خون بذاتِ خود ۸۳ر فی صد پانی ہے، جسم کے ہر خلیے میں موجود پانی سے جسم کے تمام نظام چلتے ہیں۔

موجودہ سائنسی تحقیق یہ ہے کہ جسم میں پانی کی کمی سے خون گاڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کے بہاؤ میں رکاوٹ آنے لگتی ہے۔ اور پورے جسم تک خون پہنچانے کیلئے دل کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں جسم میں پانی کی کمی ہونے سے خون کی نالیاں تنگ ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اس سے بھی دل کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ " امریکی ریاست کولمبیا کی یونیورسٹی آف ساؤتھ کورولین سے وابسطہ ڈاکٹر مارک ڈیوس کا کہنا ہے۔ کہ " ہماری بیشتر تکالیف کا تعلق ناکافی غذا کے بجائے ناکافی پانی پینے سے ہے۔ "کیلیفورنیا کی لومالنڈا یونیورسٹی کے شعبہ تحقیق کی سربراہ ڈاکٹر جیکولین نے کہا ہے کہ حسب ضرورت پانی نہ پینا دل کیلئے اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا کہ تمباکو نوشی۔ جو افراد پانی کی جگہ مشروبات، چائے، کافی استعمال کرتے ہیں ان میں بھی دل کے دورے پڑنے کے خطرات دوگنا ہوتے ہیں۔

آپ کو پانی کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ کسی قدر ہو گیا ہو گا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی دنیا اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر کرے، اس عظیم نعمت پر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کرے اور پانی کے بے جا اسراف سے بچے، ہماری عام روش یہ ہے کہ جب پانی وافر مقدار میں میسر آتا ہے تو ہم اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اچھے اور صاف ستھرے پانی کو گندہ کر کے بے مصرف بنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بارش کی شکل میں جو پانی برساتا ہے، ہم اس کا بڑا حصہ ضائع کر دیتے ہیں اور جب پانی کی قلت کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو سر پکڑ کر روتے ہیں۔ پانی کا انتظام صرف حکومتوں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہماری انسانی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے کہ اس عظیم نعمتِ الٰہی کی قدر کریں اور اس کا ضرورت بھر استعمال کریں۔ کائناتِ انسانی میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے چھٹی صدی عیسوی میں پانی کے بے جا استعمال پر قدغن لگایا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہے: عن ابن عمر قال رأى رسول الله ﷺ رجلا يتوضأ فقال لا تسرف لا تسرف. (ابن ماجہ، ج:۲، ص:۱۵)

نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا، فضول خرچی مت کرو، فضول خرچی مت کرو۔

ایک اور روایت آقا علیہ السلام سے مروی ہے: عن عبد الله بن عمر أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ مَا هٰذَا السَّرَفُ فَقَالَ أَفِي الْوُضُوءِ إِسْرَافٌ قَالَ نَعَمْ وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ. (ابن ماجہ، ج:۲، ص:۱٦)

حضرت عبد اللہ ابن عمر سے مروی کہ سرکار علیہ السلام سعد کے پاس سے گزرے، وہ وضو کر رہے تھے تو سرکار علیہ السلام نے فرمایا، یہ فضول خرچی کیا ہے۔ سعد نے عرض کیا، کیا وضو میں فضول خرچی ہے؟ فرمایا، ہاں! اگرچہ تم بہتی نہر کے کنارے پر ہی کیوں نہ ہو۔

وضو جو قربِ الٰہی کا ذریعہ اور نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے، اسلام نے اس میں بھی پانی کے بے جا استعمال سے باز رکھا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام بلاشبہ عالمِ انسانیت کا عظیم مذہب ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صحیح استعمال کا قانون بھی ہے اور حقوقِ انسانی کی بھرپور پاس داری بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں پانی کے بہ قدر ضرورت استعمال کی اہمیت کو عام کریں۔ ہمیں چاہیے کہ بے مقصد پانی کے نل کو کھلا نہ رکھیں، کوئی ٹونٹی ٹپکتی ہو تو اسے صحیح کرائیں، برتن اور کپڑے دھونے کے لیے بڑے برتن کا استعمال کریں ٹنکی کے نیچے برتن اور کپڑے دھونے سے پانی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اسی طرح نہانے کے لیے بالٹی کا استعمال کریں۔ عام طور پر شاور کے استعمال سے پانی زیادہ ضائع ہوتا ہے۔ مسجدوں میں پہلے وضو کے لیے لوٹے استعمال ہوتے تھے، پر اب عام طور پر ٹونٹی سے وضو کرتے ہیں اس سے بھی پانی کا بے جا استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ وضو میں پانی کے اسراف سے تعلق آپ حدیث پڑھ چکے ہیں۔ مسجدوں میں وضو کے لیے حسب سابق نظام کو دوبارہ زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

کاشت کاری اور کھیتی باڑی کے لیے بارش کے پانی کا استعمال کیا جاتا ہے بلکہ بعض علاقوں میں پینے کے لیے بھی بارش کے پانی پر انحصار کیا جاتا ہے۔ مگر اکثر تیز اور زیادہ بارش کا ۵۰ر فی صد حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ حکومتوں کو چاہیے کہ بڑے پیمانے پر چھوٹے چھوٹے ڈیم بنائے جہاں بارش کے پانی کو اسٹور کیا جا سکے، پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی کی حفاظت بھی کرنا چاہیے۔ یہ ذمہ داری صرف حکومت ہی کی نہیں ہے بلکہ عام لوگوں اور کاشت کاروں کو چاہیے کہ اپنی زمینوں پر حوض بنائیں یا بڑے بڑے مٹکے کاشت کی زمینوں میں گاڑ لیں۔ بارش کا یہ محفوظ پانی سیرابی میں بھی معاون ہو گا اور پانی کی نمی خود بخود بھی زمین میں شامل ہوتی رہے گی۔

اسلام نے پانی کی قدر و قیمت کے ساتھ اس کی پاکیزگی پر بھی بہت زور دیا ہے۔ آج میڈیکل سائنس نے صاف پانی کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے تو دنیا گندے پانی کے استعمال کو موت تصور کر رہی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں روزانہ ایک لاکھ پچیس ہزار افراد گدلے پانی سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ اسلام نے زندگی کے معمولات میں صاف اور پاک پانی کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے، جس طرح پینے کے لیے صاف پانی ضروری ہے، اسی طرح نہانے، دھونے اور پانی کے دیگر استعمالات میں بھی پاک اور صاف پانی کا استعمال ضروری ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کولر وغیرہ میں پاک اور صاف پانی کا اہتمام نہیں کرتے حالاں کہ کولر سے ہوا کے دوش پر پانی کا ترشح بھی ہوتا ہے جو کپڑوں اور جسموں پر پڑتا ہے اور غیر شعوری طور پر یہ مقدار کافی ہو جاتی ہے، جس سے کپڑے اور جسم ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے جہاں پاک پانی کے استعمال پر زور دیا ہے، اسی کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ پانی کو ہر ممکن حد تک ناپاک اور گندہ ہونے سے بچایا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا یبولن احد کم فی الماء الدائم الذی لا یجری. (بخاری، ج:……، ص:۳۷)
تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے نہ بہنے والے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے۔
امام نسائی روایت فرماتے ہیں: عن ابی ھریرۃ ان النبی ﷺ قال اِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهٖ وَلَا يَغْمِسْ يَدَهٗ فِيْ وَضُوْءِهٖ حَتّٰى يَغْسِلَهَا ثَلٰثًا فَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَا يَدْرِيْ اَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ. (سنن نسائی، ج:۱، ص:۴)
حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ سرکار علیہ السلام نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو جب تک اپنے ہاتھ کو تین بار نہ دھو لے وضو کے برتن میں ہاتھ نہ ڈالے، کیوں کہ تم میں سے کسی شخص کو یہ پتہ نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری۔
پاکیزگی پاک پروردگار کی محبوبیت کا ذریعہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. (سورہ بقرۃ: آیت ۲۲۲)
بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور بہت پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
میڈیکل سائنس کی تحقیق کے مطابق صاف پانی کے استعمال سے اسہال، معدے اور آنتوں کی خرابی سمیت دیگر کئی جراثیمی بیماریوں سے ۵۰ فیصد تک بچاؤ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صاف پانی انسانی ذہنی وجسمانی نشو ونما میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ بچوں کو دودھ اور پھلوں کے رس کے بجائے صاف پانی زیادہ مقدار میں پلانا چاہیے۔ کیونکہ اس سے جسم میں موجود اضافی نمک خارج ہونے میں مدد ملتی ہے
اسی کے ضمن میں ہم یہ بتادینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی میں جس طرح صاف پانی کی اہمیت ہے اسی طرح پانی پینے کے صحیح طریقے استعمال کرنے سے بھی بہت سی بیماریوں سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ پانی پینے کے اسلامی طریقے سے موجودہ سائنس نے بھی اتفاق کرلیا ہے۔ پانی بیٹھ کر پینا چاہیے، اس سے ضرورت کے مطابق پانی جسم میں جاتا ہے، جب کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے ضرورت سے زائد پانی جسم میں جاتا ہے جو استسقا کا سبب ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے ممانعت فرمائی ہے۔ اس سے معدے اور جگر کی بیماریاں لاحق ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تین سانس میں ٹھہر ٹھہر کر پانی پینا بھی مسنون ہے۔ حضرت ثمامہ بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ برتن سے پانی پیتے وقت دو یا تین سانس لیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ اسی طرح تین سانس لیا کرتے تھے۔ ایک سانس میں کھڑے ہو کر پانی پینے سے سانس کی نالی میں پانی جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔
اب ہم پانی کے تعلق سے اپنی آخری اور انتہائی اہم بات گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ آج جب کہ بہت سے ملکوں اور خاکِ ہند کے بہت سے علاقوں میں پانی کے لیے ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ ان حالات میں جن حضرات کی دسترس میں پانی ہو انھیں پیاسوں کو پانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ ٹلو پمپ لگا کر سپلائی کا پانی کھینچ لیتے ہیں یا اپنا ذاتی پمپ لگا کر اپنے ٹنک بھرے رہتے ہیں اور غریب ایک ایک قطرے کے لیے ترستا رہتا ہے۔ انھیں چاہیے کہ ضرورت مند حضرات کو پانی دینے سے اجتناب نہ کریں۔ اسلام میں پیاسوں کو پانی پلانا انتہائی اہم صدقہ، کارِ ثواب اور ذریعۂ نجات ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کسی بھی جان دار کو پانی نہ دینے سے منع کیا ہے جب تک کہ پانی کی کمی اپنے لیے ضرر رساں نہ ہو جائے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
صدقۃ الماء من موجبات الجنۃ. ترجمہ: پانی کا صدقہ کرنا جنت کو واجب کرنے والی چیزوں میں سے ہے۔
جب انسان خدائی راستوں سے بھٹکتا ہے اور اپنے خالق و رازق کی نافرمانی کرتا ہے تو پانی اس کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے یہی پانی سیلاب اور شدید بارش کی شکل میں عذابِ الٰہی بھی بن جاتا ہے۔ پانی عذابِ جہنم کی ایک قسم بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ. (سورہ محمد، آیت:۱۵)
اور انھیں کھولتا پانی پلایا جائے کہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔
اسلام اور عصر حاضر کی روشنی میں پانی کی ضرورت و اہمیت اور اس کے صحیح طریقۂ استعمال کے حوالے سے یہ ایک مختصر سی تحریر ہے۔ ہماری دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم اسلامی اصولوں اور شرعی تقاضوں سے خود بھی واقف ہوں اور اسلام کا یہ رحمت بھرا پیغام دنیا کے ہر انسان تک پہنچائیں تا کہ دنیا اکیسویں صدی کے چیلنجز کا صحیح حل تلاش کر سکے۔
☆☆☆

اختلافی مسائل: رحمت یا زحمت

مفتی محمد نظام الدین رضوی

مذہب

اسلام میں فقہی فروعی اختلافات کے ہزاروں نظائر ایسے موجود ہیں جو اس کے پیروکاروں کے لیے باعثِ رحمت قرار دیے جاتے ہیں اور آج بھی ایسے اختلافات رحمت ہو سکتے ہیں بشرطے کہ ان کی بنیادیں اخلاص و للّٰہیت پر استوار کی گئی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ دلائل شرعیہ بھی ان کی پشت پناہی کرتے ہوں۔
اخلاص و للّٰہیت کا تعلق قلبی عزائم سے ہے جن تک عام بندگانِ خدا کے علم و فہم کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے ہمیں اپنی نظر اس امر پر مرکوز رکھنی چاہیے کہ اختلاف اگر شرعی امکانات کی حدود میں ہوں تو حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اسے اخلاص و للّٰہیت پر ہی محمول کریں۔ فقہائے کرام کے ہزارہا ہزار اختلافات اس کے شاہد عدل ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ یہ اختلافات کبھی ان کے مابین عداوت کا بیج نہ بو سکے اور ان کے دلوں کے نہاں خانے میں نفرت کی خلیج کبھی حائل نہ ہو سکی بلکہ اس کے برخلاف وہ باہم اخوت و محبت اور دریا دلی کے مثالی پیکر نظر آتے تھے۔ اختلافات کی دھرتی پر محبت کا یہ خوش نما پودا، آج کے دورِ اختلاف و انتشار میں ہم سب کے لیے نمونۂ عبرت ہے۔
لیکن کیا سارے اختلافات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں — ؟
واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں —— بلکہ بہت سارے اختلافات ایسے بھی ہوتے ہیں جو معاصی و منکرات کے دائرے میں آنے کی وجہ سے مذموم قرار پاتے ہیں اور ان پر نکیر لازمی ہوتی ہے، اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس اختلاف کو معصیت قرار دیا جائے اور کس اختلاف کو استحسان یا اباحت کے درجے میں رکھا جائے، بہ لفظِ دیگر اختلاف کے باب میں معیارِ حسن و قبح و رحمت و زحمت کیا ہے؟
آیئے اس کی جستجو کریں!
فقیہ فقید المثال اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ و الرضوان انکشاف فرماتے ہیں:
"علمائے کرام تصریح فرماتے ہیں کہ مسئلۂ مختلف فیہا منکرِ شرعی و معصیتِ دینی نہیں، نہ کہ معاذ اللہ اُسے ضلالت کہنا جیسا کہ داب وہابیت ہے (وہابیت کا طریقہ) کہ صریح جہالت و ضلالت ہے۔ اگر علما بوجہ اختلاف مُتَرَدَّد فیہ ٹھہرا کر واجب الترک مان لیتے تو منکر و معصیت نہ سمجھنے کے کیا معنیٰ تھے۔ امام ابن الہمام فتح القدیر میں مسئلۃ صلوۃ الجنازۃ فی المسجد میں فرماتے ہیں:
''اَلْاِنْكَارُ الَّذِيْ يَجِبُ عَدَمُ السُّكُوْتِ مَعَهٗ هُوَ الْمُنْكَرُ الْعَاصِيْ مَنْ قَامَ بِهٖ، لَا الْفُصُوْلُ الْمُجْتَهَدُ فِيْهَا.''
جس اختلاف پر عدم سکوت واجب ہے یہ وہ اختلاف ہے جو منکر ہوتا ہے اور اس کا مرتکب عاصی قرار پاتا ہے، وہ مسائل نہیں جو مُجْتَهَدٌ فِیہ اور فقہا کے درمیان اختلافی ہیں۔
امام علامہ عارف باللہ سیّدی عبد الغنی نابلسی قدس سرّہ القدسی "الحدیقۃ الندیۃ" فصل ثانی بابِ اول میں زیرِ قولِ ماتن رحمہ اللہ تعالیٰ:
''اِذَا اُنْكِرَ عَلَيْهِمْ بَعْضُ اُمُوْرِهِمُ الْمُخَالِفِ لِلشَّرْعِ الشَّرِيْفِ.''
فرماتے ہیں:
''المراد ما ھو المجمع علیہ بین المجتہدین کالزِّنا و شرب الخمر و السرّقۃ و ترک الصَّلاۃ وما اَشْبَہَ ذٰلک.
واَمّا مالم یکن کذلک فلیس بمُنکر - قال الإمام الغزالی فی الإحیاء فی شروط المنکر: أن یکون کونہ منکراً معلوماً بغیر اجتہادٍ، فکل ما ھو فی محلّ الإجتہاد فلا حسبۃ فیہ فلیس للحنفی ینکر علی الشافعی أکلہ الضبّ والضبع ومتروک التسمیۃ، ولا للشافعی أن ینکر علی الحنفی شربہ. للنبیذ الذی لیس بمسکرٍ، إلی اٰخر ما بسطہ من الکلام فی ھذا المقام.''
"مخالف شرع امر" سے مراد وہ امر ہے جس پر مجتہدین کا اجماع ہے جیسے زنا، شراب نوشی، چوری، ترکِ نماز اور دوسرے وہ امور جو اس کے مشابہ ہیں۔

استاذ و صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

رہے وہ امور جن پر مجتہدین کا اجماع نہیں ہے تو وہ منکر نہیں۔

چناں چہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں منکر کی شرطیں شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شرط یہ ہے کہ شے کا منکر ہونا بغیر اجتہاد کے معلوم ہو کیوں کہ جو امر محل اجتہاد میں ہوتا ہے اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا حنفی کو یہ روا نہیں کہ شافعی پر یہ اعتراض کرے کہ وہ گوہ، بجو اور جس جانور کے ذبح پر قصداً بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو، کیسے کھاتا ہے، یوں ہی شافعی کو یہ روا نہیں کہ غیر نشہ آور نبیذ پینے کی وجہ سے حنفی پر اعتراض کرے۔

اسی میں ہے: ''إنما المنکرُ ما وقع الإجماع علیٰ حرمتہ والنّھی عنہ.'' یعنی منکر محض وہ ہے جس کے حرام ہونے اور اس سے ممانعت پر اجماع ہو۔

اسی میں ہے: ''لا ینبغی أن ینھی الواعظ عمّا قال بہ إمامٌ من أئمّۃ المسلمین، بل ینبغی أن یقع النّھی عمّا أجمَعَ الأئمّۃ کلّھم علی تحریمہ والنّھی عنہ کالزّنا والرّبا، والرّیا، والطّعن فی أولیاء اللّٰہ تعالٰی بالجھل فی معانی کلامھم وإنکار کراماتھم بعد الموت واعتقادِ أنّ ولایتھم انقطعت بموتھم ونھی النّاس عن التبرک بھم إلٰی غیر ذٰلک من القبائح اھ مختصراً.''

مختلف فیہ مسائل میں ممانعت نہ چاہیے منع کے لائق صرف وہ باتیں ہیں جن کی حرمت پر اجماع ہے جیسے زنا و ربا و ریا۔ اور اولیا اللہ کا کلام نہ سمجھ کر ان پر طعن کرنا اور بعدِ وصال ان کی کرامت کا منکر ہونا اور یہ سمجھنا کہ انتقال سے ان کی ولایت بھی جاتی رہی اور لوگوں کو ان کے مزارات کریمہ سے برکت حاصل کرنے سے منع کرنا۔ یہ وہ بری باتیں ہیں جن کے حرام ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے۔

مقدمۂ کتاب مستطاب میں شرح مقاصد سے گزرا:

خلافاً للمبطلین حتّٰی ربّما جعلوا الإختلاف فی الفروع أیضاً بدعۃً وضلالۃً.

یعنی اہل باطل فرعی مسائل مختلف فیہا میں بھی بدعت و ضلالت کا حکم لگا دیتے ہیں۔

تحفۂ اثنا عشریہ شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی میں ہے:

''ہر کہ باوجود ایں ہمہ (اختلافات) قول جازم نماید بے باک و بے احتیاط ست۔ و ہمین ست شانِ محتاطین از علمائے راسخین کہ در اجتہادیات مختلف فیہا جزم باحد الطرفین نمی کنند۔''

(حاشیہ ازاقۃ الاثام، ص: ۱۴۴- ۱۴۵)

خاتم المحققین، حجۃ الخلف حضرت مولانا مولوی نقی علی خاں صاحب قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان جو اپنے زمانے کے عبقری فقیہ تھے) فرماتے ہیں: ''مسح رقبہ و نمازِ چاشت کے بدعت و سنت ہونے میں اختلاف ہے، پھر کیا علما انھیں واجب الترک بتاتے ہیں، فقہا صدہا جگہ بعدِ نقلِ اختلاف فعل کو جائز و مباح ٹھہراتے ہیں، بلکہ علما بحالِ اختلاف ایسے امور سے منع نہ کرنے کی تصریح فرماتے ہیں۔''

(ازاقۃ الاثام، ص: ۱۴۳)

اسی مسئلۂ اختلاف کے تعلق سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ اپنے ایک فتوے میں ارقام فرماتے ہیں:

''سیدی عارف باللہ محقق نابلسی کتاب مذکور (حدیقہ ندیہ) میں فرماتے ہیں کہ اب ہمارے شہر کی جامع مسجد میں مؤذنین جمعہ کے دن (امام کی دعا پر آمین) کہتے ہیں۔ اس کی تخریج و ثبوت ہمارے مذہب یا دوسرے مسلک میں ممکن ہے تو یہ ایسا ناجائز نہیں کہ اس کا انکار اور اس سے منع لازم ہو، منکر تو وہ ہوتا ہے جس کی حرمت و ممانعت پر اجماع ہو۔'' (فتاویٰ رضویہ مترجم، ص: ۴۸۴- ۸۵، ج: ۸، رضا اکیڈمی)

اور ایک دوسرے مقام پر بڑے اختصار کے ساتھ یہ قولِ فیصل پیش کرتے ہیں:

''بایں ہمہ انصاف یہ کہ شدتِ اختلاف کے باعث احتراز اَولیٰ اور اعتراض بے جا۔'' (فتویٰ رضویہ، ص: ۶۶، ج: ۹، رضا اکیڈمی)

مولوی سید محمد شاہ صاحب صدر دوم ندوہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے ملنے کے لیے آئے، اس موقع پر انھوں نے اعلیٰ حضرت سے کہا: ''میری رائے یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہنا چاہیے۔''

اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

''بہت بجا فرمایا، جہاں اختلافات فرعیہ ہوں، جیسے باہم حنفیہ و شافعیہ وغیرہما فرقِ اہل سنت میں، وہاں ہرگز ایک دوسرے کو برا کہنا جائز نہیں اور فحش و شنام جس سے دہن آلودہ ہو کسی کو بھی نہ چاہیے۔''

(الملفوظ، حصہ اول، ص: ۳۹- ۴۰)

میں سمجھتا ہوں کہ ان عبارات سے یہ امر بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ اختلاف کے باب میں ''رحمت و زحمت کا معیار'' کیا ہے۔ اس لیے ہمیں فقہی، فرعی مسائل میں اختلافِ رائے کرنے والے کسی عالمِ اہل سنت سے اسی معیار کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے۔ یہی رحمت ہے اور اس سے عدول زحمت۔

☆☆☆☆

فکرِ امروز

تیسری قسط

جدید علم کلام

فلسفے وقت کے گم راہ نہ کردیں تجھ کو

مولانا محمد اسحاق مصباحی

گزشتہ دو قسطوں میں علم کلام کی ابتدا، اس فن کی متداول کتابیں اور ذاتِ واجب تعالیٰ و صفات واجب کے تعلق سے لکھا گیا تھا۔ اس قسط میں صفات واجب پر بحث جاری رہے گی۔

واجب تعالیٰ کی صفات، وجوبِ وجود، علم، حیاۃ، قدرت، ارادۂ مشیت، سمع، بصر وغیرہ کی تفصیل علم کلام میں بیان کی جاتی ہے۔ واجب کی صفات میں جو خاص عقیدہ مسلم پر فرض ہے وہ یہ ہے کہ اس کی صفات قدیم ہیں اور صفات کے کمال کی اضداد عیب ہیں اس لیے ان عیوب کا ثبوت واجب کے لیے محال ہے۔

ان صفاتِ خاصہ کے علاوہ کچھ اور امور بھی کتاب اللہ اور حدیث پاک میں واجب کے لیے ثابت کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

رحمت — تجلی کرنا
غضب — قریب ہونا
استحیاء — عرش پر استوا فرمانا
نظر کرنا — کلام کرنا

جو امور کتاب اللہ میں ثابت کیے گئے ہیں ان کی نفی تو ہم نہیں کر سکتے، بلکہ ان امور کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے گا کہ یہ امور اس کے لیے ثابت ہیں جیسے کہ اس کی شان کے لائق ہیں اور ان کے ثبوت کی کیفیت معین نہیں کی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ سب اس کے لیے بلا کیف ثابت ہیں۔ ان کو ظاہر پر رکھنا گمراہی ہے، اس لیے کہ اس کی ذات اور صفات ممکن کی صفات مماثلت سے پاک ہیں۔

بعض ظاہر پرست ان آیات کو ظاہر پر رکھ کر واجب کی صفات کو ممکن کی صفات پر قیاس کرتے ہیں یہ عین گم راہی ہے۔

واجب کی صفات اور ذات کے تعلق سے عقائد کا یہ علم اور اس کا حصول ہر مکلف پر فرض ہے۔ شرح فقہ الاکبر میں ہے:

''وصفاتہ فی الازل غیر محدثۃ ولا مخلوقۃ فمن قال انھا مخلوقۃ او محدثۃ او وقف فیھا ای بان لا یحکم بأنھا قدیمۃ او حادثۃ و یؤخر طلب معرفتھا ولا یقول آمنت باللّٰہ و صفاتہ علی وفق مرادہ أو شک فیھا أی تردد فیھا و نحوھا سواء یستوی طرفاہ أو ترجیح أحدھما فھو کافر باللّٰہ.''

(شرح فقہ الأکبر لملا علی قاری ص: ۲۹)

خلاصۂ عبارت یہ ہے کہ واجب تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کہنا، ممکن ماننا یا قدیم ہونے میں شک کرنا کفر ہے۔ اور کفر و ایمان کی حد جاننا ہر شخص پر فرضِ عین ہے۔

اللہ کی صفات حیات، علم، قدرت، کلام، سمع، بصر، ارادہ، تخلیق، ترزیق، ان میں سے کسی کا بھی انکار کرنا کفر کلامی ہے۔ کفر کلامی کا مطلب یہ ہے ''عقیدۂ ثابتہ لازمہ کا انکار کفر کلامی ہوتا ہے۔''

اور اگر عقیدۂ ثابتہ لازمہ کا انکار تو نہیں کرتا ہے، بلکہ ایسی عبارت بولتا ہے یا لکھتا ہے یا عقیدہ میں لاتا ہے جس سے کسی عقیدۂ ثابتہ لازمہ کا انکار لازم آتا ہے تو ''کفر فقہی'' ہے۔ البتہ اگر یہ عبارت ایسی صریح ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش نہیں تو کفر صریح ہے اور التزامِ کفر ضروری جیسے کوئی کہے، ''اللہ تعالیٰ ہے مگر میرے احوال کو نہیں جانتا ہے'' تو صفتِ علم کا اس نے انکار نہیں کیا مگر آخری جملہ سے ہی انکار لازم آتا ہے، تو اس میں التزامِ کفر یقینی ہے۔

شرح الدوانی علی العضدیہ کے حاشیہ میں ملا عبد الحکیم فرماتے ہیں:

''اعترض بأن لزوم الکفر لیس بکفرٍ بل إلتزامہ و أجیب بأن اللزوم إذا کان بیناً فھو بمنزلۃ الالتزام.'' (ص: ۴۰)

مسلمانوں میں جو لوگ عقائد اسلامیہ سے صحیح طور پر واقف نہیں اور ان کو اہل دین کی صحبت نصیب نہیں اور خود کو تعلیم یافتہ قرار

شیخ الحدیث جامعہ رضویہ، کیمری، ضلع رام پور

دیتے ہیں یا ادیب اور صحافی ہیں مگر اسلامی عقائد سے واقف نہیں کہ ان کی تعلیم غیر مسلموں کی کتابوں اور زبانوں سے ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کے قلم سے اکثر ایسی باتیں صادر ہوتی ہیں جو واجب تعالیٰ کی صفات اور ذات کی شان کے خلاف ہیں۔ ان کو چاہیے کہ عقائدِ اسلامیہ کا علم حاصل کریں جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عموماً جو باتیں ان لوگوں سے صادر ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

بعض اشیا کے علم کی نفی، بندوں کی صفات کی نسبت باریِ تعالیٰ کی طرف جیسے انتظار، سہو، بھول، جذبات میں آنا، دھیان نہ دینا، پچھتاوا۔ اس طرح کے عیوب کو بعض لوگ مزاحیہ تحریروں، مکالموں، ڈراموں، فلموں اور اشعار میں اللہ تعالیٰ کے لیے لکھ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا انداز جناب واجب میں گستاخانہ ہے اور اس کے لیے عیوب کا اثبات ہے، لہٰذا کفر ہے۔

آج کل یہ توفیق کہاں کہ لوگ اسلامی عقائد اس کے اصل ماٰخذوں سے حاصل کریں۔ جدید درس گاہوں سے مختلف علوم میں ڈگریاں حاصل کرنا کوئی علم عقائد تو ہے نہیں اور کسی صاحب علم سے زبانی بھی کچھ حاصل نہیں کیا، پھر ایسی جرأت! اور کوئی عالم دین سمجھائے تو ایسے لوگوں کی طرف ایسے گستاخانہ وار کیے جاتے ہیں کہ بس مت پوچھیے۔ کوئی علمائے وقت کو مُلّائے بے وقت کہتا ہے، کوئی رجعت پسند، کوئی جاہل کا خطاب دیتا ہے، تو یہ لوگ دُہرے کفر میں مبتلا ہوئے۔ ایک اسلامی عقیدے کا انکار، دوسرے عالم دین کی بوجہِ دین گستاخی کہ یہ بھی کفر ہے اور دین پر بغاوت۔

اسلام میں یہ عقیدہ فرض ہے کہ ہر شے کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس میں انسانوں کے افعال بھی داخل ہیں۔ انسان اپنے فعل کا اکتساب کرتا ہے خلق نہیں۔ کوئی شے سوائے واجب تعالیٰ کے قدیم نہیں، تو اس نے سب کو عدم سے وجود بخشا ہے اور عدم سے وجود میں لانا، یہی خلق ہے۔

فلاسفہ میں کچھ لوگ مادّہ، مقدار، اور صورت جسمیہ کو قدیم مانتے ہیں اور نفس ناطقہ کو بھی اور دس عقول کو قدیم مانتے ہیں، ساتھ میں زمانے کو بھی قدیم مانتے ہیں اور واجب تعالیٰ کو صرف عقل اول کا خالق مانتے ہیں، اور جب ان کو قدیم مانتے ہیں تو معجزہ کا بھی انکار کرتے ہیں۔ فلاسفہ کے یہ عام عقائد کفر صریح ہیں، جیسا کہ تہافۃ الفلاسفہ میں امام غزالی نے اور مقامع الحدید علی خد المنطق الجدید میں امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے تحقیق فرمائی۔ کیوں کہ فلاسفہ میں ان عقائد کے ساتھ اور بھی کئی ایک مسائل جڑے ہیں، مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کو صرف عقل اول کا خالق مانتے ہیں اور باقی تخلیق کو وہ عقول عشرہ اور مادّہ و صورت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ بھی عین کفر ہے۔

ان کفریات کو ماننے کے لیے ان کے نزدیک کچھ شبہات ہیں جن کا رد علم کلام کی کتابوں میں تفصیلاً لکھا گیا ہے اور ہم ان کو تخلیق عالم کی بحث میں ذکر کریں گے۔

جدید فلاسفہ میں اکثر لوگ زمانے اور حرکت کے جزئیات کو تو قدیم نہیں مانتے ہیں، ہاں زمانۂ کلی اور کلی حرکات کو قدیم مانتے ہیں۔ کچھ لوگ زمانے کی حقیقت سے انکار تو نہیں کرتے مگر اس کی تحقیق کے منتظر ہیں۔ کچھ لوگ زمانے اور حرکت کو دورانیہ میں قدیم مانتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ مسئلۂ تخلیق کائنات سائنس کی سرحد پر واقع ہے اور سائنس کی حد میں نہیں۔ لیکن فلاسفہ آج بھی کائنات کے دورانیہ کے قدم کے قائل ہیں، یعنی اس کی شکل تو بدلتی ہے مگر اس میں قدم ضروری ہے۔ ہماری موجودہ کائنات کا وجود ایک ذرہ کے دھماکے سے ہوا اور آخر میں ایک ذرہ میں تبدیل ہو جائے گی اور پھر اس میں اتساع ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں صغر و کبر تو ہوگا مگر فنا نہ ہوگی، یہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح قدم کے قائل ہیں لہٰذا یہ عقیدہ بھی سابقہ فلاسفہ کے عقیدہ کی طرح کفر ہوگا۔

ہم یہاں صفات واجب کا ذکر کر رہے ہیں اور اس کے تعلق سے جدید و قدیم نظریات کے کفر یا ایمان سے موافقت کا بیان کر رہے ہیں۔ تخلیق عالم میں دینی اور سائنسی تفصیل بعد میں ایک مستقل فصل میں بیان کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس میں ہم اسلامی کوسمولوجی یعنی علم معدومیات کی تفصیل بیان کریں گے۔

واجب تعالیٰ کی تخلیق کائنات کے لیے تین طریقہ پر ہے:-

(۱) — عدم سے وجود مبانی کا، یعنی مادہ اور صورت کا۔

(۲) — افعال مخلوقات کا۔

(۳) — بقائے مخلوقات کا۔

اول تخلیق میں کسی ظاہری سبب کی ضرورت نہیں، بلکہ سبب کا اقرار کفر کی طرف لائے گا کہ اس سے سبب کا قدیم ہونا ماننا پڑے گا۔

دوم میں خلق، اللہ تعالیٰ کی اور افعال کا اکتساب کا اختیار اس نے مخلوقات کو دیا ہے۔

تیسری صورت میں بھی بقا کو اس نے اسباب سے باندھا ہے۔

عدم سے وجود کی طرف لانے کی نسبت ہر اعتبار سے واجب کے علاوہ کسی کی طرف کرنا کفر صریح ہے، باقی دونوں صورتوں میں مخلوق اور سبب کی طرف بقا اور اکتساب کی نیت جائز ہے بلکہ واقع مگر اس میں یہ عقیدہ ضروری ہے کہ اسباب کا خالق اور مُکتَسِب مخلوق کا خالق ضرور اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور یہ اسباب کسی بھی طرح اس کی ذات سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ان اسباب کی طرف نسبت کرنا اور یہ حقیقت عقیدہ میں رہنا کہ اصل خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور حقیقی موثر وہی ہے۔ اس نے جس کو جتنی طاقت دی ہے وہ شے اپنے عمل میں اس کی دی ہوئی طاقت اور حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔ یہ ایمان کے مطابق ہے، شرک نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی غیر کو شریک کرنا کفر ہے، شرک ہے۔ اور واجب تعالیٰ کی تخلیق سے کسی شے پر کسی شے کو معلق سمجھنا عین ایمان ہے۔

ہاں! مختلف قوموں کے یہاں اس شرک کے عقیدے کی صورتیں ہیں اور تعبیرات ہیں اور کچھ افعال ہیں۔ یہ سب چیزیں بذاتہٖ شرک نہیں بلکہ اس لیے شرک ہیں کہ وہ شرک کے عقیدہ پر دلالت کرتے ہیں، شرک کے عقیدہ کو سمجھنے میں لازم و ملزوم ہیں۔

اس کا بیان ہم انشاء اللہ شرک اور کفر کے باب میں کریں گے۔ یہاں پر یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ جس طرح اس کی ذات کو تمام عیوب و نقائص سے پاک ماننا اور تمام کمالات سے موقوف ماننا عین ایمان ہے، اسی طرح اس کے تمام افعال کو عبث اور جہل سے پاک ماننا فرض ہے۔

معرفت حق تعالیٰ:

انسان پر عاقل ہونے کی وجہ سے اپنے وجود پر اور پھر اپنے خالق کے اعتراف پر غور کرنا فرض ہے تا کہ وہ ایمان تک پہنچ سکے۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان حاصل ہو جائے اور پھر ایمان شرعی کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں یعنی لا إلٰہ إلا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پر ایمان و تصدیق کے بعد ایمانِ تفصیلی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان، رسولانِ کرام و کتبِ الٰہیہ پر ایمان، قضا و قدر پر ایمان اور یومِ آخرت پر ایمان پورا کر لے تو پھر فرائض و سنن و واجبات اور مستحبات کا علم حاصل کرے اور حرام و مکروہ کا علم حاصل کرے اور ان تمام کاموں میں عشق الٰہی اور محبتِ رسولِ عربی ﷺ اس کا رہبر ہو تو وہ ایمان کامل ہے۔

یہاں مومن کے لیے دو مرحلے ہیں۔ پہلا ایمان کا، دوسرا وصول کا۔ ایمان و عمل مکمل ہونے کے بعد وصول کا درجہ آتا ہے۔ بعض مومنوں کا وصول بنا کسی مجاہدہ کے ہوتا ہے اور بعض کا وصول مجاہدہ و ریاضت و آزمائش پر موقوف ہے۔ وصول کے بہت سے درجات ہیں:

وصول الی الذات: اس عالم میں سرکارِ دوعالم ﷺ کے علاوہ کسی کے لیے ممکن نہیں۔

وصول الی الصفات: تمام انبیائے کرام و بعض اولیائے کرام کے لیے ثابت۔ یہ وصول جتنا کامل مرتبہ ہوگا اتنا ہی اعلیٰ مرتبہ ہوگا۔

شعورِ حقیقتِ ذات ممکن نہیں اور صفات کا احاطہ تو ممکن نہیں مگر ان صفات کے آثار میں استغراق ممکن ہے اور بندوں کا یہی کام ہے کہ وہ صفات کے آثار سے واجب کو پہچانیں۔ قرآن حکیم میں اسی لیے اس کی صفات اور آثارِ صفات کا ذکر ہے۔ جب دل پر آثارِ صفات نقش ہو جائیں تو پھر ذکر و مجاہدہ کے بعد حریم صفات تک وصول ممکن ہے، مگر ان تمام حالتوں میں روحِ محمد ﷺ کا وسیلہ ضروری ہے۔

اس وصول کی منزل کو پانے کے لیے شریعتِ مطہرہ کی اتباع اور سرکارِ دوعالم ﷺ کی اقتدا تو سب پر یکساں فرض ہے، مگر مجاہدہ اور ریاضت کا انداز مختلف ہے۔ صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ یہ تھا کہ کوئی مال کا ذرہ گھر میں نہ چھوڑا، عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہ نصف نصف اور مولا علی کا یہ کہ وقتِ نماز شہادت اور اسی طرح تمام واصلین الی اللہ تعالیٰ۔ وصول الی اللہ تعالیٰ کے شرائط اور لوازم ہیں جن میں اتباع شرط

اول اور عشق شرط ثانی اور استغنا ماسوائے اللہ سے شرط ثالث اور بلا و آزمائش پر شکر شرط رابع۔ عشق میں گردن ذبح ہونے کو رکھنا اور ہر بلا کے لیے تیار رہنا ضروری اس لیے ہے کہ عشق اور وصول الی اللہ تعالیٰ بے ہمتوں کا کام نہیں ہے۔

وصول الی اللہ عقل کے راستے ممکن نہیں، عقل کا کام صرف اعترافِ ذات وصفات ہے۔ فلسفی تو اس کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ عقل کے ساتھ ہیں اور عقل کے کام کی ایک حد ہے، لیکن ایک عارف باللہ تعالیٰ زمان ومکان اور کائنات کی حقیقت کو اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہے، کیوں کہ اس پر خالق تعالیٰ کی جملہ صفات کی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

''اتقوا فراسة المومن فإنه ینظر بنور اللّٰہ تعالیٰ.''

لہٰذا جن کو حقیقت کی تلاش ہے ان کو چاہیے کہ عالم عقل کی سیر کے بعد عشق کی حد میں داخل ہوں اور پھر اس عالم کی حقیقت کو پہچانیں۔ عقل آج تک جن مسائل کے ارد گرد حیراں ہے، حقیقت زمانہ، حقیقت حرکت، فلسفۂ قِدَم، خلق کائنات، عدم، وجود ان سب کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ ساتھ وصول کے مراتب حاصل ہوں۔ یہاں پر یہ بتا دوں کہ عارفین کاملین نے جو کچھ کہا وہی حق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس مادی دنیا میں کثافت اور لطافت کے درجات ہیں، اس کے بعد عالم برزخ ہے جس میں لطافت پہلے سے اعلیٰ درجہ پر ہے، پھر عالم آثار صفات حقیقیہ ہے یا عالم لاہوت جس کی لطافت کی انتہا نہیں، اس کے بعد عالم ذات ہے جس تک رسائی نہیں۔ عالم صفات اور اس کے نیچے جس میں بے شمار درجے اور ہر درجہ میں لاکھوں پردے، ہر پردے میں لاکھوں جلوے اور ہر جلوہ میں لاکھوں کروڑوں رنگ اور ہر رنگ میں کروڑوں اربوں مظاہر اور ہر مظہر کے کروڑوں احوال، ہر حال کے لاکھوں تغیرات اور ہر تغیر کے کروڑوں منازل، ہر منزل کے لاکھوں حصے، ہر حصہ پر لاکھوں نقطے اور ہر نقطے میں اسباب کی ایک محدود لیکن لامحدود زنجیر اور اس زنجیر کا نام وقت۔ وقت کے دو تیرے ایک ماضی کی طرف اور ایک مستقبل کی طرف۔ اس آخری درجہ کا قیام مشایت پر ہے جس میں ہم آپ ہیں۔ لہٰذا اس طویل سفر کو طے کرنا اس جسم کے بس کی بات نہیں، بلکہ یہ سارے منازل روح اور عشق کے ذریعہ طے ہوتے ہیں اور مذکورہ بالا عالموں کے احوال الگ ہوتے ہیں، لہٰذا اس مادی دنیا سے عالم احد تک رسائی صرف عشق کے ذریعہ ہی ہوگی۔

یہاں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ وسیع اور تمام تر پنہائیاں لیے کائنات حق تعالیٰ کے لیے کیا حقیقت رکھتی ہے اور ہر آن اس کی کیا وقعت ہے اور جب ہر عالم کے احوال الگ الگ تو پھر ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا مناسب نہیں ہے۔ قرآن شریف اور حدیث پاک میں ان تینوں عالموں کا ذکر ہے۔ بعض لوگ ایک عالم کے احوال کو دوسرے عالم پر قیاس کرکے گم راہ ہوتے ہیں۔

''ویضل به کثیرا و یهدی به کثیرا.''

اور یہ معلوم کرنے کے لیے یہ آیت کس عالم کے تعلق سے ہے، تفسیر شخصی یعنی خود قرآن پاک کی تفسیر اور حدیث شریف کی حاجت ہے۔ یہیں سے ظاہر کہ قرآن پاک اپنے اندر کتنی وسعت رکھتا ہے، ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کو ایک خاص فصل میں ذکر کریں گے۔

تو بات یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور وصول الی اللہ تعالیٰ کیسے ممکن ہے اور توحید وصفات کا کیا مطلب ہے۔ یعنی مومن ہونے کا مطلب صرف اس قدر نہیں کہ اعتراف کرے بلکہ مومن کامل وہ ہے کہ وصول کی منازل طے کرے اور عشق حقیقی سے سرشار ہو۔ ایک عارف کی زبان میں۔

بخوردم از کفِ دلبر شرابِ عشق انواری
مکاشف شد علومِ مَن ازیں پنہانِ اسرارِ
معلم عشق چوں حق است در پیشِ سبق خوانم
حجاب از پیش بر خیزد ببینی آں چہ دلداری
ندا آمد کہ اے عاشق جمالِ پاک می خواہی
نگردی منکر از من در بلائے عشق ہشداری
بشرطِ آں برہنہ تن، شکم خالی، جگر تشنہ
حدیث است ایں چنیں اندر کتاب زاد ابراری

اگلی قسط میں ہم بابِ نبوت تحریر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(جاری)

☆☆☆☆☆

سوزِ دروں

اہلسنت وجماعت

انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک

آخری قسط

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

۱۳/ محرم الحرام مطابق ۳۱/ دسمبر ۲۰۰۹ء کو جامعہ اشرفیہ میں یومِ مفتیِ اعظم ہند کا انعقاد ہوا۔ جشن کا اہتمام حسب روایت جماعتِ سابعہ نے کیا تھا۔ توسیعی خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آئے ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی نے پیش کیا، موضوع تھا "اہلِ سنت وجماعت: انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک" یہ اہم خطاب قارئین کی میز پر بھی پیش ہے۔ امید ہے کہ سنجیدہ اور باشعور طبقہ اسے ضرور پسند کرے گا۔ از: مبارک حسین مصباحی

۷- ہمارے علما ہوں یا خانقاہوں کے سجادہ نشیں و پیر صاحبان۔ بیش تر ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے میں اور دوسروں کو کم زور کرنے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ خود ہی قائد و پیشوا و مقتدا بننا چاہتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کی قیادت و سیادت اور امارت و امامت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ نتیجے میں انتشار و افتراق اور صدہا خانوں میں تقسیم، نئے نئے مدرسے، نئی انجمنیں اور تنظیمیں مسلک کے عروج و ترقی کی نشانی نہیں، انتشار و افتراق کا پتہ دیتی ہیں۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے
(ابو المجاہد زاہد)

اگر واقعی "خورشیدِ مبیں" بننا ہے تو شخصی انا، پندارِ علم اور "ہمچو من دیگرے نیست" کے جذبے کو بالائے طاق رکھ کر متحد و متفق ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ شخصی مفاد کو چھوڑ کر اجتماعی مفاد کے لیے کام کرنا ہوگا اور یہ بڑے ایثار و قربانی کا متقاضی ہے۔

۸- ہمارے اکثر مقرر، واعظ و عالم اپنے دو تین گھنٹے کے خطاب میں گھن گرج اور بلند آہنگی کا مظاہرہ فرماتے ہیں، پُرشکوہ الفاظ کے دریا بہاتے ہیں، دوسروں پر لعن طعن کرتے ہیں، تفرقہ پیدا کر کے اور اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر کے آخر میں بظاہر خشوع و خضوع سے دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ! ملت میں اتحاد و اتفاق عطا فرما، ملت اسلامیہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دے، ہمیں دشمنوں پر غلبہ عطا فرما، ہمیں کفار و مشرکین اور گم راہ و بے دینوں پر فتح و نصرت عطا فرما۔ سبحان اللہ! کیا ان ظاہری خواہشات و تمناؤں سے اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے گا؟ صرف دعاؤں سے حالات نہیں بدلتے، اس کے لیے جہد و عمل بھی ضروری ہے۔ یہی سنتِ الٰہیہ ہے، یہی طریقِ انبیا ہے۔ قرآن مجید تو ہمیں ہدایت دیتا ہے:

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا.''

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اور یہاں حال یہ ہے کہ دوسرے مسلک کے ساتھ تو کجا دوسری خانقاہوں کے سجادہ نشیں پر آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں۔ ایک مفتی صاحب دوسرے مفتی صاحب کا نام آتے ہی ہوش و حواس کھونے لگتے ہیں اور جو منہ میں آتا ہے کہتے ہیں۔ اس صورت میں اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تو کیا ہلکے سے بھی پکڑنا مشکل ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اس کا ایک سرا پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرا چھوٹ جاتا ہے۔

دینی جلسے بھی اب وعظ و نصیحت کے لیے نہیں ہوتے بلکہ بنام کانفرنس شان و شوکت اور دھوم دھام کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پورے علاقے میں بڑے بڑے پوسٹر و بینر لگائے جاتے

ہیں، شان دار اسٹیج سجائے جاتے ہیں اور آخر میں ”فلاں مولانا صاحب نے بڑی شان دار تقریر کی، فلاں صاحب نے تو فلاں طبقہ کو بالکل ننگا کر دیا“ غیر اہم قسم کے تبصرے کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں اور گھر جا کر سو جاتے ہیں۔ اب اس حالت میں نمازِ فجر کا قضا ہو جانا تو مجبوری ہے۔

وعظ و نصیحت تو ہمیشہ سادہ و سہل انداز میں مختصر اور جامع انداز میں ہونی چاہیے، بشرطے کہ مقصد وعظ و نصیحت ہو اور خلوص و للہیت کے ساتھ ہو ورنہ زورِ خطابت اور اندازِ تقریر دکھانے کے لیے جو کچھ کہا جائے وہ کم ہی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو کہا گیا ہے۔

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

⑨ - ہم نے صرف چند علما اور بزرگوں کو ہی مرجع و ماویٰ بنا لیا ہے اور باقی سب کو بھلا بیٹھے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک ہی نام اور ایک ہی شخصیت سے اس قدر وابستہ ہو گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہمارے پاس کوئی اور عظیم شخصیت ہی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنوں نے نادانی سے اور غیروں نے دانائی اور ہوشیاری کے ساتھ ہمیں ان کے ساتھ اس طرح چسپاں کر دیا ہے کہ وہ اس مسلک کے بانی ہیں۔ آج ایک خاصی بڑی تعداد یہی سمجھتی ہے کہ ہمارے افکار و اعمال انھیں کی ایجاد اور انھیں کی تعلیمات کا نتیجہ ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ موجودہ عرس و نیاز، فاتحہ، توسل، شفاعت، مزارات پر قبے، میلاد کی محفلیں، صلاۃ و سلام وغیرہ سب کی ابتدا انھوں نے ہی کی ہے۔

ہمارا فرض تھا اور اب شدید تر ہے کہ ہم ہر دور کے اہم علما اور اولیا کی تحریروں سے ثابت کریں کہ یہ سب اعمال امت محمدیہ ﷺ میں ابتدا سے رائج رہے ہیں اور ان سب کی شرعی بنیاد ہے۔ ہمیں ہر صدی کے نمائندہ علمائے کرام کی ان تحریروں کو یک جا کرنا چاہیے جو یہ ثابت کر سکیں کہ ہر دور میں یہ افکار و اعمال رائج رہے ہیں، آج کی ایجاد نہیں ہیں۔

اسی طرح ہمیں مسلک اہل سنت پر اصرار کرنا چاہیے۔ کوئی بھی شخصیت خواہ کتنی بھی عظیم تر ہو، دین و مسلک سے بڑی نہیں ہو سکتی۔ دین و مسلک کی شناخت کسی شخصیت سے نہیں ہوتی بلکہ شخصیات کی شناخت دین و مسلک سے ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے مسلک کی عظیم شخصیت ہیں، امام ہیں، مجدد ہیں لیکن بانی نہیں۔ ہم تو محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی بانیِ اسلام نہیں کہتے اور اس قول کا رد کرتے ہیں۔ بے شک وہ اسلام کے سب سے بڑے اور آخری رسول ہیں، افضل الرسل ہیں، سید الرسل ہیں، ختم المرسلین ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں، لیکن بانیِ اسلام نہیں کیوں کہ تمام انبیا و رسل اسلام ہی کی دعوت دیتے تھے۔ اسلام تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہے۔

ہماری اس نادانی اور اغیار کی دانائی نے پاکستان کے غیر مقلد عالم احسان الٰہی ظہیر مقتول سے ”البریلویہ“ کے نام سے عربی میں کتاب لکھوا کر عالم عرب میں ہمیں بدنام کرایا اور ہمارے خلاف پائی جانے والی بدگمانی کو پختہ کرنے کی کوشش کی۔ اب آپ لاکھ جواب لکھتے رہے اور صفائی دیتے رہے، مگر وہ تو اپنا کام کر چکی۔ کسی دعویٰ کا جتنا اثر ہوتا ہے، اس کی تردید کا نہیں۔ دعویٰ نقشِ اول کی حیثیت رکھتا ہے اور نقشِ اول مشکل سے ہی محو ہوتا ہے، پھر ضروری نہیں کہ تردید بھی ان سب تک پہنچے جن تک دعویٰ پہنچا ہے۔

نہ جانے کتنے لوگ آج یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح برصغیر میں قادیانی جماعت ایک جدید جماعت ہے، اسی طرح بریلوی اور رضا خانی جماعت بھی ایک نئی جماعت ہے اور باقی سب سنی ہیں۔ اغیار نے کمالِ ہوشیاری سے اس خیال کو پھیلایا ہے اور ہم نادانی سے اس الزام کو ثابت کر رہے ہیں۔

ضرورتِ وقت یہ ہے کہ ہم اپنے خلاف پھیلی ہوئی بدگمانیوں اور افواہوں کو دور کریں اور دلائل و براہین سے خود کو قدیم اہلِ سنت کا حقیقی وارث ثابت کریں۔

⑩ - ہم دوسروں کا احتساب تو خوب کرتے ہیں اور ان پر انگشت نمائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن افسوس کہ ہم کبھی اپنا احتساب نہیں کرتے! اپنی کم زوریوں اور خامیوں پر نظر نہیں ڈالتے، جب کہ انفرادی اور اجتماعی احتساب ضرورتِ وقت

بھی ہے اور دینی تقاضا بھی۔ ہم اگر سنجیدگی سے اپنا احتساب کریں تو یقیناً کم زوریوں اور خامیوں کی نشان دہی ہو گی اور پھر اصلاح کی کوشش بھی، لیکن ہمارا تساہل، احساسِ ذمہ داری کا فقدان، آپسی اختلاف، تفرقہ بازی، طبقوں اور گروہوں میں تقسیم، ہر فرد اور ہر گروہ کے الگ نظریات، نعرے اور دعوت، اپنی ہی رائے کو حرفِ آخر سمجھنے کی عادت، دوسروں کی صلاحیت اور کارکردگی کا انکار، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی زبردست ذمہ داری سے مجرمانہ تغافل، یہ وہ اسباب ہیں جو فتنوں کا باعث اور قرآنی الفاظ میں فساد کبیر کی وجہ ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ. (الانفال، ۸۳)

منکرِ حق تو ایک دوسرے کی مدد و حمایت کرتے ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو گا۔

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں دیکھیے کہ اغیار اپنے ہزار اختلافات کے باوجود اہلِ سنت کے مقابلے میں ایک ہو جاتے ہیں اور مل کر کام کرتے ہیں، کبھی ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے اور ہمارا ہر فرد اپنی الگ اذان دے رہا ہے، کیا اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں ہم سب کا یہ فرض نہیں ہے کہ آپسی اختلاف اور گروہی عصبیت کو چھوڑ کر حمایتِ حق کے لیے ایک ہو جائیں اور مسلکِ حق کی سربلندی کے لیے متحد و متفق ہو کر اقدام کریں۔

آخر میں ایک بار پھر یہ عرض کروں گا کہ میرا روئے سخن کسی فرد یا گروہ یا ادارے کے خلاف ہرگز نہیں، واللہ! نہیں ہے۔ ہاں! میں اپنے مسلک کی سربلندی و سرفرازی چاہتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ آیئے عہد کریں کہ ہم سب مل کر اس کے لیے جد و جہد کریں گے۔ میرے خیال میں اس وقت کرنے کے کام یہ ہیں:

① - عوامی رابطے کی مہم چلائی جائے، جگہ جگہ ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر چھوٹے چھوٹے جلسے اور عوامی میٹنگ کریں، ان میں دوسرے مسلک کے لوگوں کو بھی دعوت دیں، ان سے مل کر غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کریں۔

② - ہماری ایک ایسی جماعت ہو جو خود کو عوامی رابطے اور تبلیغ کے لیے وقف کر دے۔ تبلیغی جماعت کے اس طریق کار سے اکثر لوگ متنفر ہیں کہ وہ زبردستی لوگوں کو چلّہ پر لے جانے کی ضد کرتے ہیں۔ ہماری جماعت لوگوں سے کہے کہ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں، اس کام کے لیے ہم ہیں۔ ہاں! آپ اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے خود کی اور اپنے دوستوں کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور بوقتِ فرصت تبلیغ و اشاعت بھی کرتے رہیں۔

③ - اللہ و رسول اور اولیائے کرام کی محبت کو دلائل و براہین سے واضح کریں اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

④ - ہر دور کی ضرورت اور تقاضے علاحدہ ہوتے ہیں۔ آج کے لوگ، خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کشف و کرامات اور مافوق الفطرت واقعات سے گھبراتا اور متنفر ہوتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ اچھا آج ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے ان کا تذکرہ کم سے کم کریں۔ بزرگوں کے وہی واقعات بیان کیے جائیں جن سے ان کی تبلیغِ دین اور خدمتِ خلق کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

⑤ - اپنی داخلی کم زوریوں کی نشان دہی کر کے انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اپنے غلط کار لوگوں کو بھی راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اور نہ ماننے پر ان سے براءت کا اظہار کیا جائے۔

سمع خراشی کے لیے معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ موضوع نے مجھے تلخ نوائی کے لیے مجبور کیا، پھر بھی صمیم قلب کی معذرت کے ساتھ گزارش ہے۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰه.

مغرب کی تہذیبی و ثقافتی یلغار

اثرات و نتائج اور تدارک کا اسلامی منہج

حافظ ارشد اقبال

مغربی تہذیب کی آئے دن بڑھتی ہوئی یلغار اور اسلامی تہذیب کا مسلسل دفاعی پوزیشن اختیار کرتے چلے جانا مسلمانوں کے لیے نہ صرف اپنے اعمال و افکار کو درست سمت گامزن کرنے کے لیے اہم ہے بلکہ ان کی بقا کا سوال بھی ہے؟

مغرب کی مادّی ترقی نے جس طرح پوری دنیا کو متاثر کیا وہاں امت مسلمہ بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسلام کے سوا باقی تہذیبوں کی بنیاد مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے مغربی تہذیب کو من و عن قبول کر لیا اور اگر کہیں انکار کرنے کا سوال پیدا ہوا تو وہ بھی محض رسم و رواج تک تھا، اعتقادی اعتبار سے کوئی تہذیب اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم نہ تھی جو اس سیلاب کا مقابلہ کر سکتی۔ یہ طاقت اور استدلال کی قوت صرف اسلامی تہذیب کے پاس تھی، جس وجہ سے دانش ورانِ مغرب اس کو اپنے ایجنڈے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، بعد ازاں ہنٹنگٹن کی کتاب کلیش آف سولائزیشن (Clash of Civilization) نے مغربی تہذیب کے خد و خال کو مزید واضح کر دیا۔ مغربی تہذیب کے علم بردار مادی ترقی، جدت پسندی، روشن خیالی اور اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر اسلامی تہذیب سے دیگر تہذیبوں جیسا سلوک کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے، جب کہ دوسری طرف صورت حال انتہائی ناگفتہ بہ اور "احساسِ زیاں بھی جاتا رہا" کے مصداق ہے۔

امت مسلمہ میں مغربی تہذیب کے رد و قبول میں تین گروہ موجود ہیں:

❶ ایک جماعت کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب کو قبول کر لینا چاہیے، اس نظریے کے حامی لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

❷ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب کو مکمل رد کر دینا چاہیے، مسلمانوں کے روایتی اسکول آف تھاٹ میں اس سوچ کے حاملین کی تعداد کافی زیادہ ہے۔

❸ تیسری جماعت کا خیال ہے Pick and choose کرنا چاہیے۔ اچھی چیزیں لے لینی چاہئیں اور بری چیزیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ اعتدال پسند مسلمانوں کی اکثریت اس کی طالب ہے۔

مغربی تہذیب کے وارثان اپنے افکار و خیالات کو مکمل طور پر اسلامی تہذیب پر مسلط کرنے کے درپے ہیں۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے ......؟ یہ سوال نہ صرف اپنی نوعیت میں اہم ہے بلکہ اسلام کے درخشندہ مستقبل کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معلوم کیا جائے، تہذیب کیا ہے.........؟ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے.........؟ اسلامی تہذیب کی خصوصیات، اثرات اور اس کے عوامل کیا ہیں.........؟

تہذیب کا معنی و مفہوم:-

تہذیب کا لفظ عربی زبان میں "ہ، ذ، ب" مادہ سے باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کے لغوی معنی کاٹ چھانٹ کرنا، سنوارنا اور ترتیب دینا ہیں۔ درختوں کی شاخ تراشی اور قطع و برید ان کی تہذیب ہے۔ کسی کمرے کو سنوارنا، سامان کو قرینہ سے رکھنا اور سجانا ان کی تہذیب ہے، بعد ازاں اس کے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی اور یہ لفظ طرزِ زندگی اور رہن سہن کے طور طریقوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

اصطلاح میں تہذیب سے کسی قوم کے بنیادی افکار و نظریات مراد ہوتے ہیں جو اس کے افعال کو جنم دیتے ہیں۔ انسان کے ذہن میں پہلے فکر پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ فکر عمل کی محرک بنتی ہے۔

ایم. فل. (علوم اسلامیہ) منہاج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

کسی قوم کے اعمال و افعال، اس کے نظریات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، اس کے اعمال کو دیکھ کر اس کے افکار و عقائد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مشرک اور موحد کے طرزِ زندگی میں نمایاں فرق و امتیاز ہوتا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں کہ عقیدہ اور ہو اور عمل اس کے یکسر مختلف ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح گندم کو بو کر چنے کی فصل نہیں کاٹی جا سکتی۔ شروع میں انسانی تہذیب ایک ہی تھی، پھر نسل انسانی کے پھیلاؤ، قوموں کی تشکیل، باہمی میل جول اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے سے مختلف تہذیبیں وجود میں آتی رہیں مثلاً:

①۔ ہندو تہذیب ②۔ ایرانی تہذیب ③۔ یونانی تہذیب ④۔ مصری تہذیب ⑤۔ عبرانی تہذیب ⑥۔ بابلی تہذیب ⑦۔ مجوسی تہذیب ⑧۔ عربی تہذیب ⑨۔ یہودی تہذیب ⑩۔ کلدانی تہذیب ⑪۔ مغربی تہذیب وغیرہ۔

اسلامی تہذیب:-

اسلامی تہذیب کا آفتاب، ماہ تاب کامل، درِ یتیم، حبیبِ کبریا، سید الانبیا، تاج دارِ کائنات، نبیِ اکرم ﷺ کے اعلانِ نبوت کے ساتھ طلوع ہوا۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد باقی تمام باطل مذہبوں کے مقابلے میں کلمۂ حق "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر مبنی تھی، جس نے ایرانی، کلدانی، مصری، بابلی، یونانی، ہندوستانی، مجوسی، یہودی اور نصرانی تہذیب کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ایک خدائے واحد پر ایمان نے اس تہذیب کو اتنی قوت بخشی کہ ایرانی اور رومی تہذیبیں پھر اس کے سامنے ٹھہر نہ سکیں۔ وحیِ الٰہی پر مبنی اس تہذیب نے قدیم رسوم و رواج پر مبنی تمام جاہلی تہذیبوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا۔ عقائد، عبادات، اعمال اور اخلاق کا ایسا کامل ضابطہ کسی کے پاس نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب غالب ہوتی گئی اور باقی تہذیبیں اس کے مقابلے میں دم توڑتی چلی گئیں۔

ہاں! یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایرانی، رومی، کلدانی، عیسائی اور یہودی تہذیبوں کو تو اسلامی تہذیب نے متاثر کیا۔ مگر جب مغربی تہذیب نے اپنے پر پرزے نکالے تو خود اسلامی تہذیب کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اس سوال و جواب کے لیے ضروری ہے کہ مغربی تہذیب کو اس کی صحیح حیثیت میں سمجھا جائے اور اس کی بنیادوں کا صحیح فہم حاصل کیا جائے۔

مغربی تہذیب:-

مغربی تہذیب اپنی بنیادوں میں کسی مستحکم نظریے پر موجود نہیں، جب کہ اسلامی تہذیب عقائد، عبادات، اعمال اور اخلاق میں وحیِ الٰہی کی روشنی میں محوِ سفر ہے۔ مغربی تہذیب اپنے ارتقا سے لے کر آج تک جس بنیادی نکتہ پر کھڑی ہے وہ نکتہ صرف "مادّی ترقی" ہے۔ جب کہ اسلامی تہذیب نہ صرف ایک فرد کی مادّی ضروریات کو پورا کرتی ہے بلکہ اس کے اخلاقی اور روحانی وجود کی تعمیر کا بھی بیڑا اٹھاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب صرف مادّی وجود کے مینار تعمیر کر رہی ہے جب کہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (آگ کے کنارے) پر کھڑی اپنی قسمت پر نوحہ کناں ہے۔ اقبال نے درست کہا تھا۔

> تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
> جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اہلِ مغرب نے دین و دنیا کو الگ الگ کر رکھا ہے۔ دین کا ان کے دنیوی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں، مسرت و لذت ان کی زندگی کا مقصد قرار پا چکا ہے۔ وہ آخرت سے بے فکر عریانی، بے حیائی اور فحاشی کے دامن کو تھامے روحانیت اور آخرت کو پسِ پشت ڈال کر مادّیت کی جانب بھاگے جا رہے ہیں۔

صرف مغربی تہذیب ہی ان برائیوں کو لیے ہوئے نہیں ہے بلکہ ماضی کی سب تہذیبوں کا یہی حال تھا کہ ان کے ہاں سے روحانیت غائب تھی اور مادّیت مقصدِ حیات تھا۔ ایران و روم اور مصر کے بادشاہ اپنے درباروں میں رقص و سرود کی محفلیں سجاتے۔ جب اسلام آیا تو یہ تہذیبیں اس کے مقابلے نہ ٹھہر سکیں، جب عرب کے بدوؤں نے رسولِ اکرم ﷺ کی قیادت میں اسلامی انقلاب کا علم بلند کیا تو یہ تہذیبیں اس کے آگے سرنگوں ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

اسلامی و مغربی تہذیب - ایک تقابلی مطالعہ:-

❶ اسلامی تہذیب کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. (سورۃ الاخلاص: ۱ تا ۴)

جب کہ مغربی تہذیب خواہش کو خدا بنائے ہوئے ہے۔ ایسے

لوگوں کی حقیقت کو بھی خدائے لم یزل نے بیان کیا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ. (سورۃ الفرقان: ۴۳)

اے حبیب! کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہش کو خدا بنالیا۔

مغربی تہذیب کے حامل افراد وحیِ الٰہی کی روشنی میں زندگی نہیں گزارتے بلکہ نفس وشیطان کی پیروی میں اپنی زندگی کے سفر کو طے کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ.

(سورۃ الانعام: ۱۲۱)

❷ اسلامی تہذیب میں دوسرا عقیدہ رسالت ہے، مسلمان اپنی پوری زندگی نبی محتشم ﷺ کے طریقے کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں۔ جب کہ فرزندانِ مغرب کسی ایک شخص یا ذات کو ہدایت کا روشن مینارہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر فیصلہ اپنی عقل ودانش کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جب کہ مسلمان "عقل پیش کن بمصطفیٰ" کے مصداق زندگی گزارتے ہیں۔

❸ اسلامی تہذیب میں تیسرا عقیدہ، عقیدۂ آخرت ہے۔ جو انسان کو جزا وسزا، وعدہ وعید، انذار وتبشیر کا ایک مکمل نظام فراہم کرتا ہے، جب کہ مغربی تہذیب جزا وسزا کے عقیدے سے بالکل ماورا ہے۔

نتیجتاً اب اگر عقائد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مغربی تہذیب، خدا کے مقابلے میں خواہش..... رسالت کے مقابلے میں عقل.... اور آخرت کے مقابلے میں جزا وسزا سے خالی زندگی کی بنیادوں پر قائم ہے۔

یہ چیز واضح ہے کہ عقائد کے باب میں مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب کو کوئی زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ہاں! یہ بات درست ہے کہ عقیدے کے طور پر نہ سہی لیکن عملی طور پر مسلمان کم زور ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ عقائد کے باب میں مغربی تہذیب کے حاملین بھی کثیر تعداد میں اسلام کو قبول کر رہے ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔

❹ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی اصل جنگ اخلاقی اصول ہیں اور تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ بھی اصل میں اخلاقی اصول وضوابط کی فتح وشکست کا نظریہ ہے۔ اخلاقی اعتبار سے جو تہذیب جتنی زیادہ مضبوط ہوگی، وہی پوری دنیا پر حکمرانی کرے گی..... وہی تہذیب دنیا کو نیو ورلڈ آرڈر دے گی..... وہی تہذیب دنیا کی امامت کی مستحق ہوگی....... کیوں کہ ریاستیں چند اخلاقی اصولوں پر قائم ہوتی ہیں، نشوونما پاتی اور اپنا نظام تشکیل دیتی ہیں۔

مغرب مادی ترقی کی وجہ سے آج دنیا پر حکمرانی نہیں کر رہا ہے بلکہ حکمرانی کے باب میں چند اخلاقی اصول ہیں جن کی وہ پاس داری کرتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس نے بہت سارے اخلاقی اصولوں کی دھجیاں بھی بکھیری ہیں لیکن مغربی ممالک نے ان اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزیاں اپنے ملکوں میں نہیں بلکہ باہر کی دنیا کی حکومتوں کے حوالے سے کی ہیں۔

اخلاقی اصول -- مغرب اور ہمارا طرزِ عمل:

اخلاقیات کے باب میں چند اہم اخلاقی اصول جن کی مغربی تہذیب اور معاشرے میں پیروی کی جارہی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

❶ سادگی:-

سادگی ہمارا طرۂ امتیاز تھی اور ہماری تہذیب کی ایک بنیادی قدر تھی۔ خلفائے راشدین سے لے کر آج تک بہت سارے مسلم حکمران سادگی کو اپنا شعار سمجھتے تھے، کیوں کہ ان سب کے سامنے اسوۂ مصطفیٰ ﷺ تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے حکمران اپنی اس تہذیبی قدر کو چھوڑ چکے ہیں۔ ہمارے حکمران بڑے بڑے محلات میں جب کہ یورپ کے بہت سارے حکمران آج بھی چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں، پبلک ٹرانس پورٹ استعمال کرتے ہیں اور عوام کے ٹیکس سے جو پیسہ اکٹھا ہوتا ہے اس میں بد دیانتی نہیں کرتے۔

❷ مساوات:-

اسلامی تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت مساوات ہے۔ اسلام طبقاتی تقسیم، قوم وقبیلہ، رنگ ونسل کے فرق وامتیاز کا قائل نہیں، اسلامی تہذیب میں امیر وغریب، آقا وغلام اور عربی وعجمی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ خلیفۂ وقت بھی نماز میں عام مسلمانوں کے برابر کھڑے ہوتے ہیں۔ اسلام میں عزت وعظمت کا مدار وانحصار خوفِ خداوندی پر ہے۔ ایک غلام بھی اپنے ذاتی اوصاف کی بنا پر اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کی مثالیں قرونِ اولیٰ میں تو بہت ہیں، ہندوستان میں غلاموں کے ایک پورے خاندان نے حکومت کی ہے۔ جو تہذیب مساوات ویکسانی کی علم بردار نہ ہو وہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسلام کی تہذیب کا طرہ امتیاز بقول شاعر

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مساوات جو اسلامی تہذیب کی شناخت تھی آج خود مسلم ممالک میں غریب الغربا ہے۔ آج بہت سارے عربی ممالک عجمی مسلمانوں کو اپنے ہاں زمین کا حقِ ملکیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ خود پاکستان میں لسانی اور علاقائی بنیاد پر کئی تحریکیں موجود ہیں۔ مغرب میں بھی ایک وقت تک یہی صورتِ حال تھی، لیکن آج وہ اس صورتِ حال سے کافی حد تک نکل چکے ہیں۔ نیٹو اور یورپی یونین کی صورت میں وہ عملاً ان چیزوں کا اظہار کر رہے ہیں۔

❸ امانت ودیانت:-

آپ ﷺ نے انسانی تہذیب کو جو معیار دیا اس کے نتیجے کے طور پر امانت ودیانت اور اخلاص کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تاریخ طبری میں ہے کہ مسلمان جب مدائن پہنچے اور مالِ غنیمت خازن کے سپرد کر دیا۔ لوگوں نے کہا، ہم نے اس قدر قیمتی سامان کبھی نہیں دیکھا۔ لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ اس نے اس میں سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو تمھیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا، میں یہ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ تعریف کروگے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام عامر تھا اور وہ قبیلہ عبد قیس کا ایک فرد تھا۔ (تاریخ طبری: ۴/ ۶)

امانت ودیانت کے ہزارہا روشن واقعات سے بھری تاریخ، اسلام کی تہذیبی وراثت کی آئینہ دار ہے۔ مگر پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج مسلمان اسی حوالے سے بہت کم زور، کاہل اور سست واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں بد دیانتی اور قومی خزانہ لوٹنا باعث افتخار سمجھا جاتا ہے، جو حرام کی دولت سے آسائشِ حیات اکٹھا کرتا ہے اسی کو سیلوٹ کیا جاتا ہے۔ جس قوم میں امانت نہ رہے اور بد دیانتی اجتماعی وجود کا حصہ بن جائے، پھر وہ اس قابل نہیں ہوتی کہ خدائے لم یزل اسے دنیا کی امامت کا امین بنائے۔

❹ عدل وانصاف:-

قرآن کریم اور احادیثِ طیبات میں بار بار عدل وانصاف کا حکم ہوتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (سورۃ المائدۃ: ۸)

عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (سورۃ الحجرات: ۹)

اور انصاف کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور پھر تاجدارِ کائنات ﷺ کا ارشاد بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے:

"کہ اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو محمد (ﷺ) اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

قرآن وحدیث کے ان ارشادات اور اسلام کی روشن تاریخ کے ہزاروں واقعات کے باوجود آج عدل وانصاف کی عمارت مسلمانوں کے ہاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر انصاف سربازار ماتم کر رہا ہے اور وہ ماتم کیوں نہ کرے، کیوں کہ ہم نے بے انصافی کے آہنی پنجوں سے اس کے چہرے کو لہو لہان کر دیا ہے جب کہ مقابلے میں مغربی ممالک میں بھی بے انصافیاں اور بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، مگر ایک تو ان کی شرح بہت کم ہے اور دوسرا عدل وانصاف کے حوالے سے ایک ایسا سسٹم معرضِ وجود میں آچکا ہے جس سے ہر شخص قانون کا احترام کرتا ہے۔

مغرب میں اخلاقی قباحتیں اور اسلام:

وہ اخلاقی خوبیاں جن کو مغربی تہذیب اپنے اندر سمو چکی ہے اور موجودہ اسلامی تہذیب میں مسلمان اپنے اخلاقی وجود کا حصہ نہیں بنا سکے آپ پڑھ چکے ہیں۔ آیئے! اب اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ اس کے ساتھ ساتھ بہت ساری اخلاقی قباحتیں بھی ہیں جن کا آج مغرب شکار ہے اور اس باب میں خود مغربی تہذیب تاریخ کے کٹہرے میں مشکل سے سانس لے رہی ہے۔

مرد کا مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا، عورت کا عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا، بہت سارے ملکوں میں عورتوں کا جنسی ملاپ کے لیے مردوں کو رقوم دے کر بک کرنا، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پر بے حیائی اور عریانی پر مبنی تصاویر کا عام ہونا، خاندانی سسٹم کی تباہی، انٹرنیٹ پر بے حیائی سے بھرپور فلموں کی لاکھوں کی تعداد میں اشاعت اور اسی طرح کی اخلاقی قباحتیں آج مغربی تہذیب کا حصہ ہیں اور یہی وہ یلغار اور چیلنج ہے جو اسلامی تہذیب کو درپیش ہے، اسی کا مسلمانوں کو مل کر مقابلہ کرنا ہے۔

مغرب کی مادی ترقی کی بنیاد جن چند اخلاقی اصولوں پر قائم ہے، وہ اصل میں تو اسلامی تہذیب کا ورثہ تھے لیکن افسوس کہ ہم ان کو چھوڑ چکے۔ بالفاظ دیگر عمدہ اخلاق ہمارے ہاں پنپ نہ سکے اور اخلاقِ رذیلہ میں ہم بڑھتے چلے گئے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ہمارے اخلاقِ حسنہ کو بگاڑنے میں سب سے بڑا کردار مغرب کے گرے ہوئے اخلاق ہیں۔ مسلم معاشرے میں فارن فنڈز مختلف NGO کو مغربی تہذیب کی ان ہی قباحتوں کے فروغ کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کے انھیں دشمنوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ کو محفوظ کرنا ہے۔ میڈیا کی آزادی اور حقوقِ نسواں کے نام پر جن گندے اور غلیظ پروگرام اور اشتہارات کو دکھایا جارہا ہے، وہ اسی منصوبے کا حصہ ہیں۔

مغربی دانش وروں نے اپنی تہذیب کو فروغ دینے اور اسلامی تہذیب کو تباہ کرنے کے لیے ہر حوالے سے غور و فکر کیا وہ یقیناً اس نقطے پر پہنچے کہ ان کا تعلق قرآن اور صاحبِ قرآن سے مضبوط ہوگا تو پھر یہ اخلاقی قباحتوں کا شکار نہیں ہوسکیں گے اور اگر مسلمانوں کے پاس محبت و اسوۂ رسول ﷺ کا نسخۂ کیمیا موجود ہے تو پھر ہماری تدبیریں ختم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک ایسا نظام تعلیم دے دیا گیا ہے جہاں قرآن اور صاحبِ قرآن کا وہ مقام نہیں جو ہونا چاہیے۔ آج مسلمانوں کا تعلق جتنا رسالت مآب ﷺ کی سنت سے مضبوط ہونا چاہیے تھا اس کا عشرِ عشیر بھی موجود نہیں۔

تدارک کیسے ممکن:-

صاحب "سیرت الرسول" مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے ذریعہ نسبت رسول ﷺ کے اصل تصور کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ آج کی نوجوان نسل جو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہے، اس آفاقی حقیقت سے باخبر ہو کر پھر اسے اپنے آقا و مولا ﷺ کے ساتھ وہ تعلق استوار کرلے کہ اس کی نظروں کو دانشِ فرنگ کے جلوے کبھی خیرہ نہ کرسکیں۔ بقول اقبال۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اور انھیں دین حق کی اس کامل تعبیر کی صحیح معرفت نصیب ہو جسے اقبال نے اس شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ان حالات میں عشق رسول ﷺ کی اہمیت کو قرآن و حدیث اور سیرت کی روشنی میں از سر نو نمایاں کرنا اشد ضروری بلکہ ناگزیر ہو چکا ہے تاکہ عصر حاضر کے فکری بگاڑ اور عظمت و محبتِ رسول ﷺ سے ناآشنائی کے سبب پیدا ہونے والے روحانی زوال کا ممکنہ حد تک ازالہ کیا جاسکے۔ ہماری نظر میں ایک طرف حضور سیدِ عالم ﷺ کی وہ محبوبانہ عظمت و شان ہو جو آپ ﷺ کو بارگاہِ خداوندی میں حاصل ہے اور آپ ﷺ کی روحانی شوکت و رفعت کا وہ علو جس کے پھریرے اقلیم فرش و عرش پر پیہم لہرا رہے ہیں اور دوسری طرف آپ کی سیرتِ طیبہ کے فکری، علمی اور عملی عظمت کے وہ پہلو ہوں جن سے دنیائے علم و عمل جگمگا رہی ہے۔ اس جامع اور ہمہ جہت تصور کو حتی المقدور الفاظ کا جامہ پہنا کر عوام الناس میں متعارف کرایا جائے تاکہ تعلیماتِ اسلام اور سیرتِ نبوی ﷺ کا ایسا متوازن اور جامع تصور متعارف کرایا جاسکے جو بیک وقت نظروں اور عقلوں کو بھی مطمئن کرے اور دلوں اور روحوں کی اجڑی بستی بھی سیراب کرے۔

آج اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ان صحابۂ کرام اور صلحائے امت کے تذکرے عام کیے جائیں جنھوں نے اپنی زندگیوں کو حضور ﷺ کی محبت اور والہانہ عشق کی بھٹی میں سے گزارتے ہوئے قدم قدم پر ایسے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں کہ رہتی دنیا تک کوئی محب اپنے محبوب کے لیے محبت کی دنیا میں ایسے نذرانے پیش نہیں کرسکتا۔ اس کی انھیں اداؤں کو آج بھی ہم اپنے لیے نمونہ بنا سکتے ہیں کیوں کہ پریشان امت کے دکھوں کا مداوا حضور ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر سنت و اتباع رسول ﷺ کی طرف بلائے بغیر ناممکن ہے۔

اس خزاں رسیدہ چمن میں بہاریں اسی وقت آسکتی ہیں جب آج کے پریشان حال نوجوان اپنے سینے سے عشق و محبت کے وہی تیر پھر پار کریں جن سے ابوبکر و عمر اور بلال و بوذر نے اپنے دل چھلنے کیے تھے۔ صحابہ کی طرح یہ سوزشِ عشق نہ ہوگی تو معرکہ ہائے بدر و حنین بھی برپا نہیں ہوسکیں گے اور نہ راتوں کی تاریکیوں میں شب زندہ دار اپنے نالہ ہائے نیم شبی سے قدسیانِ فلک کو محو رشک کرسکیں گے۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

تاریخی بصیرت

دنیا کی پہلی ذہین ترین حکمراں خاتون

جاوید احمد عنبر مصباحی

تختِ شاہی لگا ہوا ہے۔ سارے خدام دست بستہ حاضر ہیں۔ ان خدام میں جن بھی ہیں اور انس بھی، چرند ہیں پرند بھی۔ جلالۃ الملک بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ اپنی تمام رعایا کو دیکھ رہے اور ان کا جائزہ لے رہے ہیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کی سرحدوں کا منکسر المزاج شہنشاہ اپنے خدام میں سے "ہد ہد" کو غیر حاضر پاتے ہیں، سخت ناراض ہوتے ہیں کہ بغیر پیشگی اطلاع کے دربار شاہی سے غیر حاضر کیوں ہوا؟؟

اس پر لازم تھا کہ وہ پہلے مجھے خبر کرتا پھر سیر و تفریح کو جاتا۔ آج اسے اس کی خطا کی سزا دے کر رہوں گا۔

کچھ دیر بعد "ہد ہد" دربارِ شاہی میں حاضر ہوتا ہے۔ غضبناک بادشاہ غصے اور کرخت لہجے میں پوچھتا ہے "ہد ہد تم کہاں تھے؟ بغیر بتائے دربار شاہی سے غیر حاضری کی ہمت کیسے ہوئی......؟۔ آج تمہیں اپنی غلطی کی سزا مل کر رہے گی۔"

ہدہد نے عرض کیا! حضور مجھے بخش دیں۔ میں سیر و تفریح میں اپنی سرحدوں سے نکل کر دور چلا گیا تھا۔ مگر میرا یہ دور جانا اور راہ بھٹکنا مصیبت کے بجائے رحمت ہی ثابت ہوا۔ میں نے آپ کی سرحد سے باہر ایک ملک دیکھا ہے جس کا نام "سبا" ہے۔ ملک سبا میں ایک خاتون حکمرانی کرتی ہے۔ وہاں کسی چیز کی قلت نہیں ہے اس ملک میں دنیا کی ہر چیز اور آسائش کا ہر سامان مہیا ہے۔ مگر نعمتِ الٰہی کی تمام [illegible] واع سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود وہ خدائے عز و جل کو چھوڑ کر سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ اپنے تمام افعال و کردار اور اپنی عبادت و ریاضت کا محور اسی کو سمجھتے اور مانتے ہیں۔ ان کی ہر نذر، ہر تقرب، ہر قربانی، اور ان کے ہر تہوار سورج کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے منائے جاتے ہیں۔

شہنشاہ کہتا ہے: اچھا! ہم تیری بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ تو سچ بول رہا ہے یا پھر میرے عتاب سے بچنے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو نے خود سے سزا کو ٹالنے کے لئے ایک زبردست کہانی گڑھ لی ہے؟ خیر! تفتیش کے بعد ہی حقیقت کے رخ سے نقاب اُٹھے گا۔

سنو! میرا یہ خط لے جاؤ اور اس ملک سبا میں ڈال دو، جہاں ایک عورت حکمرانی کرتی ہے۔ اور جہاں معبودِ واحد کو چھوڑ کر غیر اللہ کو عبادت و ریاضت کا قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ خط کا مضمون یہ تھا: "اللہ کے بندے سلیمان کا خط ملکۂ سبا بلقیس کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم سلام اس پر جو حق کی پیروی کرے۔ **اما بعد**: سنو! سرکشی نہ کرو اور مطیع و فرماں بردار بن کر چلی آؤ"

ہُدہُد خط لے کر ملک سبا جاتا ہے اور ملکۂ سبا بلقیس بنتِ شراحیل کے محل میں گھس کر اس کے سینے پر رکھ دیتا ہے۔ اور ان کے ردِ عمل کو دیکھنے کے لئے روشندان میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ملکہ ہڑ بڑا کر اُٹھی اور خط دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ (خود سے) یہ خط یہاں کون رکھ گیا ہے؟ میرے حجرۂ خاص میں کون آیا تھا......؟

ارے......! یہ تو دوسرے ملک کی مہر زدہ خط ہے......اسے یہاں تک کس نے پہنچایا؟ (خدام سے مخاطب ہوکر) سنو! تمام درباریوں کو دربار شاہی میں حاضر ہونے کا حکم دو۔

دربار شاہی میں ہنگامی میٹنگ میں حاضر ہونے والے وزرا اور افسران پریشان ہیں، ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھ رہا ہے۔ کیا ہوا؟ ملکہ عالیہ کو کچھ پریشانی ہے؟ یا پھر دیگر کوئی اور اہم بات ہے؟ ملکہ سبا بلقیس درباریوں کو وہ خط دکھا کر مشورہ طلب کرتی ہے۔

بتاؤ ہمیں کیا [illegible]نا چاہیے......؟

اس بادشاہ نے ہمیں دوٹوک لہجے میں اپنا محکوم بننے کو کہا ہے۔ کیا ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے؟ یا پھر گستاخی اور زبان درازی کی سزا طاقت استعمال کر کے دی جائے۔؟

ایک جوشیلا وزیر اُٹھ کر کہتا ہے: ملکہ! اس پڑوسی بادشاہ نے ہماری غیرت کو چیلنج کیا ہے۔ ہمیں اپنا غلام بنانے کی خواہش کا اظہار کر کے اس نے ہماری حریت اور جرأت کو للکارا ہے جس کا جواب ہمیں فوجی طاقت سے دینا چاہیے۔ ان دشمنوں کے شہروں کو روند کر اور ان پر گھوڑے دوڑا کر

سنگتراش واڑی، گلبرگہ، کرناٹک۔

ہمیں یہ پیغام دینا ہوگا کہ ہم اتنے بے بس اور کمزور نہیں ہیں جو اپنی آزادی کا سودا کرلیں۔ میں ملکۂ سبا سے دست بستہ گزارش کروں گا کہ وہ فوج کی تیاری اور حملے کا حکم دیں۔"

دوسرا افسر اُٹھتا ہے اور کہتا ہے: "ملکہ عالیہ! ہمیں کوئی بھی فیصلہ لینے سے قبل کافی سوچ وفکر سے کام لینا چاہئے۔ ہمیں اس ملک پر لشکر کشی سے قبل اپنی عسکری قوت کا موازنہ کرنا چاہیے۔ اور جب ہمیں یہ پختہ یقین ہوجائے کہ ہم ان کے شہروں پہ "بلقیسی جھنڈا" لہرانے میں کامیاب ہوجائیں گے تو اس وقت فوج کو حرکت میں لاکر اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادیں۔"

پھر اس کے بعد کافی دیر تک سناٹا طاری رہا اور تمام درباری ملکۂ بلقیس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھنے لگے جس پر مختلف قسم کی شکنیں اس کے ذہنی اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں۔ لمبی خاموشی اور کافی غور وفکر کے بعد دربارِ شاہی میں ملکہ سبا کی آواز گونجی:

"ہمیں کچھ بھی کرنے سے قبل انجام کے متعلق سوچنا چاہئے۔ ہر جرم کا علاج صرف طاقت کا استعمال ہی تو نہیں ہے۔ ہماری حریت و آزادی پہ حملہ شہنشاہ نے کیا اس کے عوام نے نہیں۔ اور اگر ہم اس ملک پر حملہ کرتے ہیں تو نہ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے ہمارے جسم آلودہ ہوجائیں گے۔ اور اگر بالفرض ہماری فوج میدان جنگ میں کام آگئی تو پھر ہماری اور تمہاری زندگی کا کیا ہوگا۔ وہ ہمارے ملک کے فاتح اور حکمراں ہوں گے۔ ان کے پاس ہمارے ساتھ ہر طرح کے سلوک، ظلم وزیادتی اور ناانصافی کا جواز موجود ہوگا کیوں کہ ہر فاتح قوم مفتوح قوم سے اس طرح کا رویہ روا رکھتی ہے۔

ذرا سوچو تو سہی! شکست کے بعد تمہاری بہن بیٹیوں کا کیا ہوگا......؟ شاید انہیں اپنی عفت بچانے کے لئے زمین کا دو گز ٹکڑا بھی نہ مل سکے جہاں چھپ کر وہ فاتح فوجیوں کی ہوس رانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ تمہارے بچے جو آج آزادی اور خوش حالی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور آسائش وفراخی کے سمندر میں غوطہ زن ہیں کل دو وقت کی روٹی کو ترس جائیں گے۔ اسی لیے طاقت سے زیادہ عقل کے استعمال پہ غور کرو۔ عقل کے استعمال سے ہی ہم صحیح راہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوں گے۔

معزز بزرگو! اس دنیا کے شہنشاہ حریص اور لالچی ہوتے ہیں، جنہیں کچھ تحفے تحائف دے دیے جائیں یا کچھ اہم اور نادر ہیرے جواہرات ہدیہ کردیے جائیں تو وہ خوش ہوجاتے ہیں اور دینے والوں سے بڑی خوش اخلاقی اور خندہ رُوئی سے پیش آتے ہیں۔ چناں چہ ہم اگر اسے تحفے تحائف بھجوادیں تو وہ ہم سے بہت خوش ہوگا، ہماری طرف اُٹھنے والی اس کی حریص نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی اور ہم اپنی آزادی اور خوشحالی کو بچانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

جیسے ہی ملکۂ سبا بلقیس کی تقریر ختم ہوتی ہے ہر طرف سے کلمات تحسین کی برسات ہونے لگتی ہے۔ ملکہ کا یہ مشورہ تمام درباریوں کو پسند آتا ہے اور انہیں فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہماری حکمراں ایک عورت ہوکر بھی مردوں سے کم ذہین وفطین نہیں ہیں۔ چنانچہ تجویز کے مطابق انہوں نے منذر بن عمرو نامی شخص کو قاصد بنا کر ملک سبا کے نادر و بے مثال اور اہم ہیرے جواہرات کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ کیا۔ جب یہ قاصد انمول ہیرے اور موتیوں پر مشتمل ایک عظیم تحفہ لے کر سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوا تو شہنشاہ (سلیمان علیہ السلام) تحفوں کو دیکھ کر سخت غضبناک ہوئے اور نہایت سخت لہجے میں کہا:

"تم اور تمہارے ملک والے مجھے بے وقوف سمجھتے ہو جو مجھے تحفے دیکر بہلانے کی کوشش کررہے ہو؟

تحفے اور رشوت لے کر خوش ہونا اور اپنے فرض سے انحراف میری فطرت کے خلاف ہے۔ میں ان شہنشاہوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی سرحد اور اپنے خزانے میں اضافے کے لیے پریشان اور سرگراں رہتے ہیں۔ میں خدا کا وہ فرستادہ نبی ہوں جسے اس نے توحید کی کرنوں کو پھیلانے کے لئے منتخب کیا ہے۔ تم چھوڑ دو ان غیر جاندار چیزوں کی پرستش، آفتاب پرستی کو الوداع کہہ دو، یہی میرے لیے تحفہ ہے۔ مجھے دنیا کی دولت سے نہیں عقبیٰ سے پیار ہے۔

سنو! جاکر کہہ دو اپنی ملکہ سے کہ ہم سرکشوں کو سبق سکھانا اچھی طرح جانتے ہیں۔ حکم عدولی کرنے والوں کی گوشمالی کرنے کا فن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ اگر تمہاری ملکہ اور تمہارے عوام نے ہماری اطاعت سے انکار کیا تو پھر انہیں اس لشکر کا سامنا کرنا پڑے گا جس کی مثل دیکھنے سے دنیا آج تک قاصر رہی ہے اور جس کے سامنے عالم کا کوئی فوجی دستہ ٹھہرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

سنو......!! کہہ دینا کہ زندگی عزیز ہو تو ہماری اطاعت شعاری کا پٹہ گلے میں لٹکا کر آئیں، ورنہ ہماری ناقابلِ تسخیر فوجی قوت کا مقابلہ کرنے کو تیار رہیں۔"

ملک سبا سے جو قاصد تحائف کے ساتھ مسکراتا آیا تھا وہ رنجیدہ رنجیدہ اور بوجھل قدموں سے اپنے ملک واپس جارہا تھا۔ وہ حیران وپریشان تھا کہ یہ بادشاہ کس قسم کا ہے، جو تحفے تحائف اور قیمتی موتیوں کو ٹھکرا رہا ہے۔ اسے اپنی فوجی قوت پر غرور ہے۔

جب وہ قاصد ملک سبا پہنچا اور دربارِ شاہی میں سلیمان علیہ السلام کا حکم سنایا تو وزرا اور فوجی افسران غصے سے انگارے اگلنے لگے۔

مگر ملکۂ سبا بلقیس نے اپنی خداداد فراست سے جان لیا کہ وہ شخص ضرور کوئی خدائی فرستادہ اور خدائی قوت والا ہے جو جواہرات کو ٹھکرا کر اطاعت الٰہی اور توحید باری کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ شخص عام شہنشاہوں سے مختلف نظر آتا ہے جو تحفے لے کر خوش ہوتے اور اپنے خزانے میں زیادہ سے زیادہ جواہرات جمع کرنے کے حریص ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی اور مختلف بادشاہ سے ملنا چاہیے۔

شہنشاہ سلیمان علیہ السلام کا دربار سجا ہوا ہے، وزرا اور سرکاری افسران اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں اور شاہ عالم سلیمان علیہ السلام اپنے بے مثل تخت پر جلوہ بار ہیں۔ ہر ایک تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ ملکۂ سبا بلقیس ہماری مملکت کا قصد کررہی ہیں۔ ملک سبا کا ایک وفد ملکہ کے ہمراہ دربار سلیمانی میں شرف یابی کی خاطر کوچ کرچکا ہے اور یہاں سے چند کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ شہنشاہ اپنے درباریوں سے مخاطب ہوکر ارشاد فرماتا ہے:

سنو! میں چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا کے آنے سے قبل ہی ان کا تخت شاہی مجھ تک پہنچ جائے، تاکہ یہ عظیم معجزہ دیکھ کر انہیں ہماری اور ہمارے معبود واحد کی صداقت وحقانیت کا یقین ہوجائے۔ ان کے دلوں سے کفر وضلالت کی ظلمتیں رخصت سفر باندھ کر نور وہدایت کو جگہ دینے پر مجبور ہوجائیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ عظیم معجزہ دیکھ کر سورج پرستی کے عادی لوگوں کے دل کی دنیا بدل جائے گی اور وہاں سورج کی کرنوں کے بجائے خدائے واحد کے بے مثل اور انسانی تصورات سے کوسوں دور "نورِ عظیم" کی تیز شعاعیں پہنچ جائیں گی۔

تم میں سے کوئی ایسا ہے جو وفد سبا کے آنے سے قبل تخت بلقیس کو میرے سامنے پیش کرسکے۔؟

ذکوان! نامی جن اُٹھ کر عرض کرتا ہے: حضور بادشاہ سلامت! میں آپ کے کرسی سے اُٹھنے سے قبل ہی وہ تخت آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش کردوں گا۔

اس کے بعد ایک انسان آصف بن برخیا عرض گذار ہوتا ہے: جلالۃ الملک شہنشا عالم! میں تخت بلقیس کو پلک جھپکنے کی مدت میں حاضر خدمت کردوں گا۔ شہنشاہ (آصف بن برخیا سے) ٹھیک ہے، اُٹھا لاؤ۔

آصف بن برخیا: حضور! اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ شہنشاہ نے آنکھوں کو جھپکانے کے بعد جیسے ہی دوبارہ کھولا تو ایک خوبصورت بیش قیمت اور صناعی کے شاہکار ایک دلکش اور جاذب نظر تخت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پایا۔ زبان سے فوراً شکرِ الٰہی جاری ہوگیا۔ "ھذا من فضل ربی" (یعنی یہ میرے رب کا فضل وعطیہ ہے) اور حکم دیا کہ تخت کی صورت بدل دو، اس کے آگے کے پائے کو پیچھے اور پیچھے والے کو آگے کردو، تاکہ ان کا امتحان ہوسکے کہ وہ اپنے تخت کو پہچانتے ہیں یا نہیں؟

جب وفد سبا دربارِ سلیمانی میں پہنچا تو ملکہ سمیت تمام افراد کی آنکھیں اپنے تخت کے مثل دیکھ کر خیرہ ہوگئیں۔ وہ حیران ہوگئے کہ یہ تخت شاہ سلیمان علیہ السلام کا ہے یا ملکۂ سبا بلقیس کا......؟ اگر یہ ہمارا تخت ہے تو پھر یہاں پہنچا کیسے؟ جب کہ ہم تو اسے سات محلوں کے اندر بند کرکے اور ان محلوں پر نگہبان مقرر کرکے آئے ہیں.......... شہنشاہ سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو تخت دکھاتے ہوئے سوال کیا: آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے؟

حاضر دماغ اور ذہین ملکہ نے جواب دیا: شاید یہی ہے۔

شہنشاہِ سلیمان کے سوال کا جواب صرف ہاں یا نہ تھا مگر ذہین ترین ملکہ نے لفظ شاید لگا کر گول مول اور پیچ کا جواب دیا۔

سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو نو تعمیر محل میں جانے کو کہا۔

جب ملکہ سبا بلقیس محل کے دروازے پر پہنچی تو پانی دیکھ کر اپنی کپڑے کو پنڈلیوں تک اُٹھالیا جب کہ حقیقت میں وہ ہیرے وجواہرات سے بنا محل تھا جس کے داخلی دروازے شیشے کے تھے اور شیشے کے نیچے پانی رواں تھا اور اس میں مچھلیاں تیر رہی تھیں، انہیں چیزوں کو دیکھ کر ملکہ بلقیس کو یہ شبہہ ہوا کہ دروازے پر پانی جاری ہے۔

مگر جب دروازے سے اندر داخل ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ یہ ایک ہیرے جواہرات سے بنایا گیا بے مثل قلعہ ہے۔ اس عظیم الشان قلعے اور تخت والے معجزے کو دیکھ کر ملکہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا: "بے شک اب تک میں گمراہی کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی کہ معبودِ حقیقی کو چھوڑ کر ایک مخلوق سورج کی عبادت میں اپنی زندگی برباد کرتی رہی، بے شک میں ایمان لاتی ہوں سلیمان علیہ السلام کے معبودِ برحق پر۔ ☆☆☆☆☆

انوارِ حیات

شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کامسلک و منہاج العقیدہ

شاہ محمد فصیح الدین نظامی

شریعتِ اسلامیہ کے مسائل دو قسم کے ہیں:

(۱) وہ جن کا تعلق صرف اعتقاد اور تصدیقِ قلب سے ہے۔

(۲) وہ جن کا تعلق عمل سے ہے۔

پہلی قسم کانام عقائد ہے اور دوسری قسم کو اعمال کہتے ہیں۔ عقائدِ اسلام کو اعمالِ سے وہی تعلق ہے جو درخت کی جڑ کو اس کی شاخوں اور عمارت کو اس کی بنیادوں سے ہوا کرتا ہے۔ اصل الاصول عقائد توحید، رسالت اور قیامت ہیں۔ علم العقائد کے تمام مسائل انھیں تین اصولوں کے فروع اور شاخیں ہیں جن پر ایمان ہر مسلمان کے لیے فرضِ عین ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اس لیے شریعتِ اسلامیہ نے ہر معاملے میں خواہ اعتقادات ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا سیاسیات، فطرتِ انسانی کالحاظ کرتے ہوئے متوازن رہبری کی اور مسلمانوں کے سامنے ایسی شاہ راہ رکھ دی جو افراط و تفریط سے پاک غلو و تنقیص سے منزہ اور ہر قسم کے معائب سے محفوظ ہے۔ مسلمانوں کو "امتِ وسط" کے لقب سے سر فراز کیا گیا۔ اس کے معنی وہ ملت ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں افراط و تفریط سے بچ کر توسط کے راستہ پر قائم رہتی ہے۔ اسلام توازن و اعتدال اور کمال و جمال کا مذہب ہے، یہی توسط اسلامی تعلیمات کی روح بھی ہے اور مذہب کی جان بھی۔ شریعت کی تشکیل و تکمیل میں توسط دستوری و اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ فرمانِ نبوی ہے:

"خیر الأمور اوسطها" "بہترین معاملہ وہ ہے جو درمیانی ہو۔

امر کا اطلاق ہر چیز پر ہوتا ہے، اعتقادات کے باب اور ایمانیات کے مسئلہ میں جو کہ پہلی اور بنیادی سیڑھی ہے، اس میں بھی یہی پابندی ہے کہ افراط و تفریط سے بچیں اور معتدل طریقہ اپنائیں۔ ملت اسلامیہ کے نفوسِ قدسیہ اسی راہ پر گام زن اور داعی رہے۔

بانی جامعہ نظامیہ، حامیِ کتاب و سنت، ماحیِ شرک و بدعت، شیخ الاسلام، حضرت امام محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

"دوسرے ادیان میں افراط و تفریط کا ہونا اور دینِ اسلام اس سے بَری ہونا اس سے ثابت ہے کہ یہود اور نصاریٰ کی توحید میں افراط و تفریط ہے اور دینِ اسلام میں توسط، دیکھیے! یہود خدائے تعالیٰ میں صفاتِ نقص بندوں کے ثابت کرتے ہیں چناں چہ اس کو معاذ اللہ فقیر کہتے ہیں اور ان کا قول ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا تو معاذ اللہ تھک گیا اور نصاریٰ، مسیح ابن مریم اور اللہ کے ثالثِ ثلاثہ ہونے کے قائل اور احبار و رہبان کے لیے ربوبیت ثابت کرتے ہیں۔ دیکھیے! یہود نے خدائے تعالیٰ کو بندوں کے برابر کر دیا اور نصاریٰ نے بندوں کو خدا کے ہم سر بنا دیا، بخلاف اہلِ اسلام کے کہ خدائے تعالیٰ کو تمام نقائص سے منزّہ اور بَری سمجھتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی کی عظمت اس حد تک کرتے ہیں کہ شانِ کبریائی تک نہ پہنچنے پائے۔

اسی طرح مسئلہ نبوت میں بھی افراط و تفریط ہے، چناں چہ یہود انبیا کی توہین کرتے ہیں بلکہ قتل تک کر ڈالتے تھے اور نصاریٰ حواریوں کو بھی رسول سمجھتے اور ان کی اتباع کو مثلِ انبیا کی اتباع کے بالذات لازم سمجھتے ہیں۔ بخلاف اہلِ اسلام کے کہ نبی ﷺ کی اطاعت کو وہ بالذات ضروری سمجھتے ہیں اور علما کی اطاعت بھی کرتے ہیں مگر اس وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ کے احکام کو انھوں نے خوب سمجھا ہے۔ تلاش کرنے سے بہت سی نظیریں مل سکتی ہیں کہ دوسرے ادیان و میں افراط و تفریط ہے اور ہمارا دین متوسط ہے۔ کیوں نہ ہو حق تعالیٰ فرماتا ہے: وکذلک جعلنٰکم امۃً وسطاً۔"[1]

شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقی مزید تحریر فرماتے ہیں:

مہتمم کتب خانہ جامعہ نظامیہ، حیدر آباد

"پھر جس طرح ہمارا دین متوسط ہے اسی طرح اہلِ سنت کا مذہب بھی متوسط اور افراط و تفریط سے دور ہے، دیکھیے! صفاتِ الٰہیہ میں کس قدر افراط و تفریط ہے۔ معتزلہ تو ان کی بالکل ہی نفی کر دیتے ہیں اس وجہ سے کہ "قدم" خاص صفتِ الٰہی ہے اگر کل صفات بھی قدیم ہوں تو "تعددِ قدما" لازم آئے گا جیسا کہ مواقف کے باب وغیرہ میں لکھا ہے اور مجسمہ جتنے آیات و احادیث صفات کے باب میں وارد ہیں سب کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں۔ چناں چہ ان کا اعتقاد ہے کہ خدائے تعالیٰ کی صورت ظاہری انسان کی سی ہے۔ ان کے خدا کا قد سات بالشت کا ہے گوشت وغیرہ سے مرکب دو مویہ نورانی تاج اوڑھے عرش پر ٹیکا لگائے بیٹھا ہے۔ سب اعضا اس کے ہلاک ہو جائیں گے مگر چہرہ باقی رہے گا، جیسا کہ مواقف اور تلبیس ابلیس اور تمہید میں لکھا ہے۔

دیکھیے! کس قدر افراط و تفریط ہے بخلاف ان کے اہلِ سنت و جماعت خدائے تعالیٰ کے ان تمام صفات کو مانتے ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے فرمایا ہے: "لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر" اس کا کوئی کسی بات میں مثل اور شبیہ نہیں، نہ اس کی سماعت اعصاب سے متعلق ہے، نہ بصارت آنکھ کے پردوں سے۔ کیوں کہ ہر صفت، موصوف کی شان کے لائق ہوا کرتی ہے۔ جیسے خدائے تعالیٰ جسمانیت اور لوازم جسمانیت سے منزّہ ہے، اس کی صفات بھی منزّہ ہیں۔ چوں کہ ہم لوگ اس قسم کی صفات جسمانیات میں دیکھتے ہیں، اس لیے عموماً خیال اسی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ حالاں کہ غور کیا جائے تو ان امور کو جسم سے عقلاً کوئی تعلق اور مناسبت نہیں، سماعت اور کان کے پٹھے کو خیال کیجیے تو دونوں میں کوئی ذاتی علاقہ نہ سمجھا جائے گا اور ممکن نہیں کہ عقل دونوں میں تعلق ثابت کر سکے، اسی طرح اور صفات کا بھی حال ہے۔ بہر حال مسلمان کا کام یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح اپنی صفات کی خبر دی ہے اس کو اعتقاداً مان لے اور اس کی کیفیات کو علمِ الٰہی کے حوالے کر دے اور ہر صفت میں مایلیق بشانہ خیال کرے، کیوں کہ عقلا نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ قیاس الغائب علی الشاہد صحیح نہیں۔ غرض کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب صفاتِ الٰہیہ میں افراط و تفریط سے بَری اور متوسط ہے۔"

حضرت شیخ الاسلام آگے مزید تحریر فرماتے ہیں۔

"مواقف میں لکھا ہے کہ شیعہ میں ایک فرقہ ہے جس کو "مفوضہ" کہتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پیدا کر کے تمام دنیا کا پیدا کرنا آپ سے متعلق کر دیا۔ وہابیہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ بھی ہم جیسے ایک معمولی آدمی تھے۔ اہلِ سنت و جماعت کہتے ہیں کہ بے شک آدمی ہیں مگر آدمیوں سے بلکہ تمام عالم سے افضل ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو "رحمۃ للعالمین" بنایا اور "علم اولین و آخرین" آپ کو عطا ہوا۔ اس کے سوا اور بہت ساری خصوصیتیں ہیں جن کو حقانی علما خوب جانتے ہیں۔

"کرامیہ" کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جس حادث کی طرف ایجادِ خلق میں محتاج ہوتا ہے اس کو اپنے میں پیدا کرتا ہے یعنی ارادہ اور لفظ "کن" قدرتِ قدیمہ سے اپنے میں پیدا کرتا ہے اور یہ حوادث چوں کہ اس میں موجود ہیں، اس لیے وہ محلِ حوادث ہے۔ "جبائیہ" کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ اس ارادہ کی وجہ سے مُرید ہے۔ اہلِ سنت کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ میں صفتِ ارادہ قدیم ہے البتہ اس کے تعلقات حادث ہیں، اس سے اس ذاتِ منزّہ کا محلِ حوادث ہونا لازم نہیں آتا، غرض کہ اہلِ سنت و جماعت درجۂ توسط میں ہیں۔"[2]

آپ مذہب سنت و جماعت کی حقانیت کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اسلام میں قدیم سے جو مذہب قرناً بعد قرنٍ چلا آرہا ہے وہ مذہب "اہلِ سنت و جماعت" ہے اور اس کے سوا جتنے مذاہب ہیں سب حادث ہیں، جن کا موجد ایک شخص ہوا کیا، مثلاً "مذہبِ قدریہ" کا موجد "معبد جہنی" ہے جو صحابہ کے زمانہ میں تھا اور جس صحابی نے اس کی یہ بدعت سنی اس سے اپنی برأت ظاہر کر کے اس کی مخالفت کا اعلان کیا۔ اسی طرح مذہبِ اعتزال کا موجد "واصل بن عطا" ہے جو تابعین کے زمانہ میں تھا۔ اسی طرح کل مذاہب باطلہ کا حال ہے جو مذہبِ اہلِ سنت و جماعت سے علاحدہ ہوکر قرآن میں ایسی بدنما تاویلیں کرتے ہیں جو صراحۃً تحریف ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق حسبِ ضرورت حدیثیں بنالیتے اور جو حدیثیں اپنے مقصود کے مخالف تھیں ان کو موضوع قرار دیتے یا تاویلیں کرتے، کیوں

کہ نئی بات کا موجد جو تمام امتِ موجودہ سے علاحدگی اختیار کرتا ہے، جب تک ایسی کارسازیاں نہ کرے کوئی شخص اس کا ہم خیال نہیں بن سکتا، بخلاف اس کے اہلِ سنّت و جماعت کا جو ہر موجد کے زمانہ میں موجود تھے ایسی کارروائیوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف اہلِ سنت و جماعت کا مذہب ایسا ہے جس میں کسی کی ایجاد کو دخل نہیں اور یہ مسلّم ہے کہ ہمارا آسمانی دین کسی ایجاد اور اختراع کو جائز نہیں رکھتا۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ نے صاف فرمادیا کہ اس دین میں ۷۳/ مذہب بنائے جائیں گے مگر وہ کل مذاہب ناری ہیں اور ناجی ایک ہی مذہب ہے۔ کسی نے پوچھا وہ کون سا مذہب ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

کمافی المشکوٰۃ عن عبد اللّٰہ بن عمرو قال قال رسول اللّٰہ ﷺ وتفترق أمتی علی ثلاث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الاملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللّٰہ ﷺ قال ما انا علیہ واصحابی. رواہ الترمذی وفی معناہ ما رواہ احمد وابوداؤد.

اسی وجہ سے تابعین نے احادیث اور اقوالِ صحابہ کو محفوظ کر لیا تاکہ وہ ناجی مذہب ہاتھ سے جاتا نہ رہے اور ان کے بعد کے طبقات میں بھی ان کی پوری پوری حفاظت ہوتی گئی۔ ہر چند اہلِ مذاہبِ باطلہ نے بہت کچھ فکریں کیں کہ اپنے خیالاتِ باطلہ کو دینی مسائل اور اعتقادات میں مخلوط کر دیں۔ چناں چہ طلاقتِ لسانی سے کام لیا، بعض سلاطین کو اپنا ہم خیال بنا کر مسلمانوں پر دباؤ ڈالا، جعلسازیاں کیں۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ ان کی کچھ نہ چل سکی اور ان کے تراشیدہ خیالات دین میں ایسے ممتاز رہے جیسے دودھ میں مکھی، جن کو مسلمانوں نے نکال کر پھینک دیا اور بفضلہٖ تعالیٰ وہی خالص دین ہم تک برابر پہنچ گیا۔ نحمد اللّٰہ علی ذلک۔"[3]

حضرت شیخ الاسلام، مذہبِ اہلِ سنت کے عقائد و معمولات اور اس کی حقانیت کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

عظمتِ نبی و آدابِ رسالت: "شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ قرآن شریف صرف توحید اور احکام معلوم کرانے کے لیے نازل ہوا ہے مگر یقین ہے کہ جب ان آیات میں غور و تامل کیا جائے گا تو ضرور یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ قرآن شریف علاوہ ان احکام کے آں حضرت ﷺ کی عظمت اور آداب سے بھی روشناس کرتا ہے۔"[4]

رسول کی توہین کا جواب: "آخری زمانے کے بعض لوگ رسول کے معنٰی "ہرکارہ" لے کر توہین کرتے ہیں، کس قدر خدائے تعالیٰ کی مخالفت کی جارہی ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کے جوابات دے کر حضرت کی فضیلت ثابت کریں۔"[5]

حضورِ اکرم خاتم النبیین ہیں: "وصف خاتم النبیین خاصہ آں حضرت ﷺ کا ہے جو دوسرے پر صادق نہیں آسکتا اور موضوع اس لقب کا آنحضرت ﷺ ہے کہ عند الاطلاق کوئی دوسرا اس مفہوم میں شریک نہیں ہو سکتا۔ پس یہ مفہوم جزئی حقیقت ہے۔"[6]

آں حضرت ﷺ کا مثل نہیں: "اس میں شک نہیں کہ آں حضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے مثل نہیں ہو سکتے، کیوں کہ وہ خالق ہے اور آپ مخلوق۔ مگر یہ کہنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ جس طرح حق تعالیٰ کا کوئی مثل نہیں آں حضرت ﷺ کا بھی مثل نہیں۔"[7]

حضورِ اکرم ﷺ نور ہیں: "مفسرین نے "الم تر" کے معنی "الم تعلم" لکھا ہے مگر اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ حضرت اپنی نورانیت کے ساتھ اس وقت موجود تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ہاتھی آپ کو سجدہ کر رہا ہے اور تمام لشکر کو پرندے ہلاک کر رہے ہیں اور سب بھاگے جارہے ہیں۔"[8]

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضور نور تھے، اس لیے آپ کا سایہ بھی نہ تھا۔ شیخ اسلام فرماتے ہیں۔ "حضرت کا پورا جسم ہی نرالا تھا، دیکھنے کو تو پورا جسم مگر اس کا سایہ ندارد۔"[9]

انکارِ احادیث: "حدیث کو بلا وجہ رد کر دینا یا اس سے انکار کرنا سوا اس کے نہیں کہ آں حضرت ﷺ کو دشمن بنالینا ہے۔ العیاذ باللہ۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو سکوت چاہیے نہ یہ کہ "حکم بالوضع" کرنا (یعنی موضوع کہہ دینا) جو من وجہ رد ہے۔"[10]

کثرتِ درود اہلِ سنت کی نشانی: "صرف ایک یا دو بار درود شریف ادائے فرض کے خیال سے پڑھ لینا اور ایسی تقریریں کرنا کہ مسلمانوں کی رغبت کم ہو جائے، مسلکِ اہلِ سنت و جماعت کے خلاف ہے اور خلافِ مرضی آں حضرت ﷺ، بلکہ

خلافِ مرضی تعالیٰ بھی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلک۔"[11]

صلاۃ و سلام عرض کرنے کا طریقہ: "جب کسی خاص وقت میں سلام عرض کرے تو چاہیے کہ کمالِ ادب کے ساتھ کھڑا ہو اور دست بستہ ہو کر عرض کرے: السلام علیک یا سیدنا سید الاولین والآخرین. السلام علیک یا سیدنا رسول اللّٰہ۔ اسی طرح کے الفاظ کے ساتھ سلام کرے جن سے حضرت کی عظمت معلوم ہو۔"[12]

قیامِ تعظیمی: "اب یہاں شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ قیام عبادت کے مشابہ ہے، اس لیے جائز نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ، جب عین عبادت میں یہ سلام جائز ہوا تو "مشابہ بالعبادہ" میں کیوں کر جائز نہیں ہوگا۔"[13]

فقہ قرآن و حدیث سے ثابت: "ہر شخص میں صلاحیت نہیں کہ خود قرآن و حدیث سے وہ (مسائل) نکال سکے، اس لیے علما شکر اللّٰہ سعیہم نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ مختلف آیات و احادیث اقوالِ صحابہ وغیرہم سے تحقیق کر کے ہر ایک مسئلہ مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کہ ان میں یہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ ایک مدت کی کوشش میں انھوں نے ہر ایک جزئی مسئلہ کا حکم قرآن و حدیث سے نکال کر ایک علم ہی مستقل مدون کر دیا، جس کا نام فقہ ہے۔ یہ ہے "حقیقتِ فقہ۔"[14]

اس لیے مسلمان بھائیوں پر لازم ہے کہ وہ غیر مذہب والوں کی صحبت اور ان کی کتابوں سے پرہیز کریں، کیوں کہ گم راہی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"غیر مذہب والوں کی مصاحبت (دوستی کرنا، ساتھ رہنا) اور مکالمت (بات چیت کرنا) اور ادیانِ باطلہ کی کتابوں کے مطالعہ سے اعتقاد پر برا اثر پڑتا ہے، گو آدمی دین دار اور فاضل ہو۔"[15]

فرقۂ وھابیہ اور خوارج کی حقیقت: "احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ فرقۂ وہابیہ، خوارج کی ایک شاخ ہے مگر اس وجہ سے کہ نئے طور پر اس کا خروج ہوا اس کا نام جداگانہ قرار پایا اور وہ فرقہ اپنے بانی کی طرف منسوب ہوا، اسی وجہ سے یہ لوگ اپنے آپ کو "محمدی" کہتے ہیں۔ مگر محتاط علما نے جب یہ دیکھا کہ عوام الناس انھیں ضرور برا بھلا کہیں گے اور اس میں حضور کے نامِ مبارک کے لفظ کی توہین ہوگی اس لیے وہ "وہابی" کے نام سے موسوم کیے گئے۔"[16]

میلاد النبی ﷺ کی مجلس: "ذرا سوچنے کی بات ہے کہ ذکر شریف کی مجلسیں ہوا کریں اور اس کی برکتوں سے مسلمان فیض یاب ہوتے رہیں تو اس سے کسی کا کیا نقصان؟"[17]

آثارِ مبارک کا ادب: "ہم آخری زمانے کے مسلمانوں کو کس درجے کا ادب ان آثارِ مبارکہ کے ساتھ کرنا چاہیے جن کا بطور واقعی آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب ہونا لاکھوں کے عقیدوں سے ثابت ہے۔"[18]

صحابۂ کرام کا معیارِ حق: "ہم پر ان (صحابہ) کی حق شناسی اور تعظیم لازم ہے، کیوں کہ وہ ہمارے حق میں وجودِ دین باعث ہوئے۔ اگر وہ جاں فشانیاں نہ کرتے تو دین ہم تک نہ پہنچتا۔"[19]

فضیلت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: "چوں کہ نبی ﷺ نے آخری وقت خدمت امامت جو ذاتِ مبارک سے وابستہ تھی آپ کو (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تفویض فرمایا اور اپنا خاص مصلیٰ یعنی سجادہ آپ کے حوالے کر کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمعِ عام میں آپ کو اپنا سجادہ نشین قرار دیا۔"[20]

امورِ خیر کی پابندی: "امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایک حدیث اور ترجمۃ الباب کے لکھنے سے قبل غسل کر کے مقامِ مقدس (قبر النبی ﷺ اور منبر شریف کے درمیان) میں دو رکعت نماز پڑھنے کا جو التزام کیا تھا وہ نہایت خوش اعتقادی پر مبنی ہے۔ چند امورِ خیر کا کسی خاص امر میں التزام کرنا کوئی قباحت نہیں بلکہ مستحسن ہے۔"[21]

بیعت کی حقیقت: "چوں کہ وہ بیعت سنتِ نبوی تھی، اس زمانے میں فوت ہونے لگی تو بزرگانِ دین نے اِس بیعت کا طریقہ جاری کر دیا اور اپنے مریدوں کو تلقین کی کہ اپنی جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دو یعنی احکامِ الٰہی کی تعمیل کرو تو تمھیں خدا تعالیٰ جنت دے گا۔ جب انھوں نے قبول کر کے بیعت کی یعنی ہاتھ میں ہاتھ ملایا اور حضرات نے بھی خدا کی طرف سے ہاتھ ملایا تو وہ اصل بیعت

پوری ہوگئی۔"(۲۲)

صالحین کا توسل: "اپنی حاجت روائیوں کے واسطے شفاعت طلب کرنا تو کسی طرح شرک نہیں ہو سکتا، اب رہا یہ کہ وہ سنتے ہیں یا نہیں؟ یہ مسئلہ دوسرا ہے۔ اس کے دلائل کتبِ کلامیہ میں مذکور ہیں۔ اتنا تو قرآن شریف سے بھی ثابت ہے کہ خدائے تعالیٰ ان کو لوگوں کی باتیں سنا سکتا ہے:- کما قال اللہ تعالیٰ: ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور.

جب یہ ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ ان کو زائرین کی باتیں سنا سکتا ہے جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے تو دور رہنے والوں کی دل کی باتیں بھی ان کو سنادے تو کیا تعجب ہے!"(۲۳)

بزرگوں کی بے ادبی: "اب بہت غور وفکر کے بعد مسلمانوں کو گم راہ کرنے کے لیے اس (شیطان) نے بے ادبی کا دروازہ کھولا اور بے ادبی کو راست گوئی کا نام دیا۔ اب کیسی ہی ناشائستہ بات کیوں نہ ہو، اس لباس میں آراستہ کر کے احمقوں کے دماغ میں اتار دیتا ہے اور کچھ ایسا بے وقوف بنا دیتا ہے کہ راست گوئی کی دھن میں نہ ان کو کسی بزرگ کی حرمت وتوقیر کا خیال رہتا ہے اور نہ اپنے انجام کا۔"(۲۴)

مسلمانوں کے راستہ سے ہٹنے کا انجام: "ہمارا دین وایمان وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو فرمایا اور وہ ہم تک نسلاً بعد نسلٍ پہنچا، کیوں کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے کہ مسلمان لوگ جس راستے پر ہوں وہی اختیار کرو اور جو کوئی اس راستے سے جدا ہوا وہ دوزخی ہے۔"(۲۵)

====[حواشی وحوالہ جات]====

(۱) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ ششم، ص:۲۴۸ تا ۲۵۲، مجلس اشاعۃ العلوم، شبلی گنج، حیدر آباد۔
(۲) ایضاً، ص:۲۴۸ تا ۲۵۲ –
(۳) امام محمد انوار اللہ فاروقی، حقیقۃ الفقہ، حصہ دوم، ص:۴۴ تا ۴۵ –
(۴) امام محمد انوار اللہ فاروقی، انوارِ احمدی، ص:۲۱۶ –
(۵) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ:۱۱، ص:۲۱۶۔
(۶) امام محمد انوار اللہ فاروقی، انوارِ احمدی، ص:۷ –
(۷) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ:۱۱، ص:۵۷ –
(۸) ایضاً، حصہ:۱۱، ص:۴۷ –
(۹) ایضاً، حصہ:۱۱، ص:۶۵ –
(۱۰) امام محمد انوار اللہ فاروقی، الکلام المرفوع، ص:۵۳ –
(۱۱) امام محمد انوار اللہ فاروقی، انوارِ احمدی، ص:۱۳۹ –
(۱۲) ایضاً، ص:۲۶ – (۱۳) ایضاً، ص:۱۷۵ –
(۱۴) امام محمد انوار اللہ فاروقی، حقیقۃ الفقہ، ص:۲-۳ –
(۱۵) ایضاً، ص:۳۸ –
(۱۶) امام محمد انوار اللہ فاروقی، انوارِ احمدی، ص:۳۱۴ –
(۱۷) ایضاً، ص:۲۴۷ – (۱۸) ایضاً، ص:۲۳۰ –
(۱۹) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ:۱۰، ص:۲۳ –
(۲۰) ایضاً، حصہ:۱۰، ص:۹ –
(۲۱) امام محمد انوار اللہ فاروقی، الکلام المرفوع، ص:۵۳ –
(۲۲) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ:۱۰، ص:۵۷ –
(۲۳) ایضاً، حصہ:۴، ص:۸۶-۸۷ –
(۲۴) امام محمد انوار اللہ فاروقی، انوارِ احمدی، ص:۲۷۵ –
(۲۵) امام محمد انوار اللہ فاروقی، مقاصد الاسلام حصہ:۴، ص:۸۱ –

جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کو صدمہ

جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے شیخ الحدیث حضرت علامہ عبد الشکور مصباحی دام ظلہ العالی کی اہلیہ کا ۲۷ ربیع الاول مطابق ۱۴ مارچ ۲۰۱۰ء دو بجے شب میں انتقال ہوگیا۔ مرحومہ صوم وصلاۃ کی پابند، نیک سیرت اور بلند اخلاق خاتون تھیں۔ جامعہ اشرفیہ میں ان کے لیے ایصالِ ثواب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور حضرت شیخ الحدیث دام ظلہ العالی اور ان کی اولاد کو صبرِ جمیل کی توفیق رفیق بخشے، آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

آئینۂ ہند

خواتین ریزرویشن بل

صابر رضا رہبر مصباحی

مسلسل چودہ برس سے زیر التوا رہے woman right to representation بل کو آخر یو. پی. اے. حکومت نے ہزاروں ہنگامہ آرائیوں کے درمیان راجیہ سبھا میں منظور کرا ہی لیا۔ اس بل کے بعد اب خواتین کو پارلیمنٹ میں ۳۳ رفیصد ریزرویشن حاصل ہو جائے گا جب کہ سماج میں ان کا تناسب ۵۰ رفیصد ہے۔

دراصل خواتین کے سلسلے میں ریزرویشن کا ہوا دیوگوڑا حکومت نے آج سے چودہ سال پہلے کھڑا کیا تھا اور انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اس بل کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی تھی مگر بدقسمتی سے وہ پارٹی کے ایک کمزور سربراہ نکلے۔ اس کے بعد بھی گاہے بگاہے عورتوں کے لیے ریزرویشن کی بات ہوتی رہی۔ بی. جے. پی. کے دورِ حکومت میں بھی یہ مدعا اٹھایا گیا تھا لیکن فتح یابی کی گیند اس کے حصے میں بھی نہ آئی اور بالآخر بازی کانگریس مار گئی اور اس کا کریڈٹ یو. پی. اے. نے اپنے سر کر لیا اگر چہ اس کے لیے یو. پی. اے. کو کافی مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس بل کو جس طریقے سے راجیہ سبھا میں پیش کیا گیا اور اس کے مخالفین نے اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، نائب صدر جمہوریۂ ہند کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اور پھر بل کے مخالفین کو مارشلوں کے ذریعہ ایوان سے باہر کر دیا گیا، یہ ساری چیزیں ایک جمہوری ملک کے وقار کے لیے کتنی افسوسناک ہیں۔

ہمارے سامنے خواتین ریزرویشن بل سے متعلق دو باتیں بڑی حیران کن ہیں۔ اول یہ کہ کسی کا بھی خواتین کو ریزرویشن دیے جانے کی مخالفت نہ کرنا اور دوسرا اس بل کو منظوری دلانے کے لیے کانگریس، لیفٹ، بی. جے. پی.، شیوسینا، سنگھ پریوار سمیت آپس میں سانپ اور نیولے کی سی زندگی گزارنے والی پارٹیوں کے فقید المثال اتحاد کا مظاہرہ کرنا۔

واضح رہے کہ خواتین کو ان کی مناسب نمائندگی کے خلاف کسی نے بھی موقف نہیں اپنایا اور یہی میرا ذاتی نظریہ بھی ہے مگر خواتین سے متعلق موجودہ بل میں گفت وشنید اور اصلاح وترمیم کے لیے احتجاج کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کیوں کہ اگر موجودہ شکل میں اس بل کو لوک سبھا میں بھی منظوری مل جاتی ہے تو یہ پسماندہ طبقات کی خواتین پر بہت بڑا ظلم ہوگا اور مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے خاتمہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مخالفین بل کو مسترد نہ کر کے اس میں ترمیم کی بات کہہ رہے ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ اس میں اقلیتوں کے لیے کچھ نشستوں کو مخصوص کیا جائے، یہی بات وزیر زراعت شرد پوار سمیت ملک کے کئی قد آور لیڈر بھی کر رہے ہیں۔ اس بل کے تعلق سے لوگوں میں پائے جانے والے اضطراب کو دیکھ کر این. سی. پی. سربراہ شرد پوار نے کہا تھا کہ بل کو موجود شکل میں پیش نہیں کیا جائے گا بلکہ اس میں ترمیم کی گنجائش ہے مگر سونیا گاندھی نے ان کے بیان کو مسترد کرتے ہوئے کسی بھی طرح کی اصلاح وترمیم کو خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔

بل میں ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کا ماننا ہے کہ اگر اس بل میں پس ماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے نشستوں کو محفوظ نہیں کیا گیا تو اس بل سے ان عورتوں کا استفادہ کرنا بڑا مشکل ہوگا اور ایسی صورت میں اس کا پورا پورا فائدہ اعلیٰ ذات کی خواتین کو ہوگا اور ایک طرح سے یہ بل اونچی ذات والوں کے لیے Male chauvinism کو بڑھاوا دینے کے مترادف ہوگا۔

لوگوں کے دلوں میں اس طرح کے شبہات کا جنم لینا بے سبب نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے دلیل کے طور پر خواتین پردھان بل کی حالت ہے خواتین گرام پنچایت بل سے سماج کا کون سا طبقہ مستفید ہو رہا ہے یہ بتانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

پھر یہ کہ ہمارے سماج میں خواتین بالخصوص اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے تئیں اتنی بیداری نہیں آئی ہے کہ اونچی ذات والے اسے آسانی کے ساتھ اپنا نمائندہ تسلیم کر لیں۔ ان حالات میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس بل کا پورا پورا فائدہ اعلیٰ طبقات سے متعلق خواتین ہی کو ہوگا۔

اگر ہم خواتین ممبران پارلیمنٹ کے گھریلو پس منظر کا تجزیہ کریں تو

ان شکوک میں مزید پختگی آجاتی ہے۔ گذشتہ انتخاب میں کل سیاسی پارٹیوں نے مجموعی طور پر ۱۰ر فیصد سے بھی کم خواتین کو ٹکٹ دیا اور تقریباً ۵۵۶ر عورتوں نے قسمت آزمائی کی جن میں ۵۹ر خواتین کو کامیابی ملی جو ان کے تناسب کے لحاظ سے ۱۹ر فیصد ہے۔

واضح رہے کہ کامیاب خواتین میں ۴۰ر کروڑ پتی ہیں اور گیارہ گریجوٹ اور اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والی ہیں، یہی نہیں ان ۵۹ر ممبران پارلیمنٹ میں سے ۱۷ر فیصد جرائم پیشہ ہیں یعنی ہر پانچ میں ایک جرائم میں ملوث ہیں۔ جرائم پیشہ خواتین میں ۵ر کا تعلق کانگریس اور ۴ر بی۔ جے۔ پی۔ جب کہ ایک کا رشتہ شیوسینا سے جڑا ہوا ہے۔

یہ بھی سوالات اٹھ رہے ہیں کہ خواتین کو ۳۳ر فیصد ریزرویشن دیے جانے سے پارلیمنٹ میں مردوں کا تناسب کم ہو جائے گا کیوں کہ اس بل کے آئینے میں خواتین ۳۳ر فیصد نشست پر اپنا قبضہ جمائیں گی اور ساتھ ہی وہ جنرل کیٹگری سے بھی الیکشن جیت کر مزید سیٹوں پر براجمان ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں مردوں کی تعداد کے کم ہونے کا خدشہ برقرار رہتا ہے کیوں کہ پاکستان میں عورتوں کو لگ بھگ ۱۷ر فیصد ریزرویشن حاصل ہے جب کہ وہاں کی پارلیمنٹ کی ۲۲ر فیصد نشستوں پر خواتین کا قبضہ ہے، لہٰذا اس تناظر میں یہ بعید از قیاس نہیں کہ ہمیں بھی اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑے۔ خواتین ریزرویشن بل کی جہت سے مسلمان دو خانوں میں منقسم دکھائی دے رہے ہیں ایک وہ جو اس بل کو قابل قبول گردانتے ہوئے اس میں اصلاح و ترمیم کی بات کر رہے ہیں جب کہ دوسرا اسے یکسر مسترد کر رہا ہے، ان کا کہنا ہے کہ "عورتیں لیڈر پیدا کریں، لیڈر نہ بنیں" اور وہ اس بل کو مسلم مخالف قرار دے کر اسے یہودیوں کی گہری سازش کہہ رہے ہیں۔

اس بل کی حمایت میں بی۔ جے۔ پی، شیوسینا، آر ایس ایس اور سنگھ پریوار کا ایک ہی صف میں کھڑے ہو جانا واقعی کسی بڑی سازش کی غمازی کر رہا ہے۔ یہ بات جو کہی جا رہی ہے کہ اس بل کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو خطرہ لاحق ہے، اگر ہم پارلیمنٹ کی نشستوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو اس کے پس پردہ بھی ہمیں صداقت دکھائی دے گی، اس لیے کہ پارلیمنٹ میں سیٹوں کی مجموعی تعداد ۵۴۳ر ہے جن میں ۲۱۱ر سیٹیں مخصوص ہیں اور صرف ۲۸۲ر نشست ہی جنرل ہے۔ جب کہ اسمبلی میں ۴۱۰۹ر میں ۱۱۶۷ر نشستیں محفوظ ہیں اور ۲۹۴۲ر جنرل ہے جن پر انتخاب لڑا جا سکتا ہے اور اگر سیاسی پارٹیاں چاہیں تو ان جنرل سیٹوں پر بھی خواتین کو ٹکٹ دے کر میدان انتخاب میں اتار سکتی ہیں۔ اس تناظر میں اگر مسلمانوں کے دلوں میں یہ خدشہ جنم لے رہا ہے کہ اس بل کی وجہ سے ان کی نمائندگی نہ صرف کم ہو جائے گی بلکہ ان کی سیاسی زندگی کے بھی لالے پڑ جائیں گے تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہاں! دلتوں کو اس بل سے اس لیے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ پہلے سے ہی ان کے لیے ۱۳۲ر نشستیں محفوظ ہیں۔

یو۔ پی۔ اے۔ خواتین ریزرویشن بل کے تعلق سے جس مستعدی اور دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس سے لگتا ہے کہ ہندوستان کو ترقی کی شاہراہ پر لانے کے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی چیز ہے ہی نہیں اور ریزرویشن کی سب سے زیادہ مستحق خواتین ہی ہیں جب کہ یہ سراسر غلط اور فریب کاری ہے۔ کیوں کہ جسٹس راجندر سچر کمیشن اور رنگناتھ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے ارتقائی سفر میں تیزی لانے کے لیے مسلمانوں کو ریزرویشن دیا جانا ناگزیر ہے۔ خیال رہے کہ سچر کمیشن کا قیام مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب و علاج کے لیے عمل میں آیا تھا جس نے مسلمانوں کی حالت میں سدھار لانے کے لیے انہیں ریزرویشن دیے جانے کی سفارش کی جب کہ رنگناتھ کمیشن کو اس بات کی تحقیق کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ سچر کمیشن نے مسلمانوں کو ریزرویشن کی جو سفارش کی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ رنگناتھ کمیشن نے بھی سچر کمیشن کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو ریزرویشن دیے جانے کی وکالت کی، اس کے باوجود حکومت کے نزدیک ریزرویشن کے زیادہ مستحق مسلمانوں کے بجائے عورتیں ہی ٹھہریں، خدا معلوم حکومت کے نزدیک اس کا کون سا پیمانہ ہے؟

راجیہ سبھا میں جب خواتین ریزرویشن بل کو بحث کے لیے پیش کیا گیا تو اس بیچ بی۔ جے۔ پی۔ کے لیڈر ارون جیٹلی نے کہا کہ اس بل کی وجہ سے عورتوں کی حقیقی نمائندگی ہوگی تو میرا ماننا ہے کہ پھر سچر کمیشن اور رنگناتھ کمیشن کے آئینے میں مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی لیے غور و فکر کیوں نہیں کیا جا رہا ہے؟ مسلمانوں کو ریزرویشن نہ دے کر عورتوں کو ریزرویشن وہ بھی موجودہ شکل میں دیا جانا حکومت کے دوہرے رویے کا مظہر ہے اور اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس بل کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے تانے بانے بکھر سکتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے پاس اب بھی وقت ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے جی توڑ سعی کریں اور اس بل میں کم از کم مسلم خواتین کے لیے کوٹہ مخصوص کرا لیں ورنہ لمحوں کی خطا کا خمیازہ صدیوں بھگتنا پڑے گا، اگر موجودہ شکل میں یہ بل منظور ہو گیا تو گذشتہ پچاس سالوں میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی ابتر ہو گئی اور آنے والے پچاس سالوں میں اس قوم کی کیا درگت ہوگی اس کے تصور سے ہی کلیجہ کو منہ کو آتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

آئینۂ عالم

اسلامی دنیا پر صیہونیت کے منفی اثرات

غلام مصطفیٰ رضوی

اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ سچائی کا سویرا اور باطل کا اندھیرا ہوا۔ پے در پے شکست نے صیہونیت کو بے چین کر دیا۔ ان کے دانش ور سر جوڑ کر بیٹھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تدبیریں کیں۔ حکمتِ عملی اپنائی۔ ان کی سازشوں کے کئی رُخ اور مقاصد سامنے آئے۔ مثلاً:

(۱) اسلامی علوم کا مطالعہ (تاکہ مسلمانوں کی کامیابی اور فلاح کے اسباب معلوم کر کے کاری ضرب لگائی جا سکے۔)

(۲) تخریب کاری (اندرونی طور پر اپنے جاسوس اور آلۂ کار کے ذریعے مسلمانوں میں انتشار و افتراق کو پروان چڑھانا۔ اس تناظر میں فری میشن تحریک مثال ہے۔)

(۳) تہذیبی و تمدنی حملہ (اسلامی تمدن سے دور کرنے کے لیے آزادانہ تہذیب جس میں لاقانونیت ہو رائج کرنا، مثلاً فحاشی، جنسی اختلاط، شہوانی جذبات کی پرورش وغیرہ، نیز اسلام کے مقابل دوسری مُردہ تہذیبوں کا احیا۔)

(۴) اثاثۂ اسلامی میں تحریف (اس سلسلے میں ابتداءً احادیث میں بھی تحریف کی کوشش کی گئی، اسی لیے علم اسماء الرجال محدثین نے مدون کیا۔ حال میں بھی یہ کام بعض موحدین سے لینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور فضائل رسالت والی احادیث میں تحریف و ترمیم کا گھنونا کام بعض مسلم نما افراد انجام دینے میں منہمک ہیں، یوں ہی خالص اسلامی نظریات مثلاً تصوف کو رہبانیت، عجمیت، یا پھر فلسفۂ یونان سے متاثر فکر کا نام دے کر مسلمانوں کو اس سے دور کرنے کی سازش وغیرہ۔)

(۵) پروپیگنڈہ (اسلام کے بارے میں جھوٹے اور منفی خیالات کو واقعی شکل میں پیش کرنا۔)

اس مختصر مضمون میں آخر الذکر پہلو کو ہم نقطۂ نگاہ (Point of view) بنائیں گے...... ہوا یوں کہ جب بھی اسلام کے مقابل یہودی و عیسائی اور دوسرے مذاہب سامنے آئے ناکامی و شکست سے دوچار ہوئے۔ ان کے تمام حربے ناکام رہے۔ عہد بہ عہد اسلامی فتوحات نے ان کے اضطراب کو مزید بڑھا دیا۔ بہت غور و خوض کے بعد ان لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اب اسلام کے بارے میں ایسی فکر لاشعوری طور پر پروان چڑھائی جائے کہ ذہن خود بہ خود اسلام سے دور ہو جائے۔ طبیعت اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرے۔ مثلاً: اسلام ہمدردی کا سبق دیتا ہے تو یہ مشہور کر دیا جائے کہ اسلام میں سختی ہی سختی ہے، نرمی نہیں۔ اسلام محبت کا درس دیتا ہے تو یہ مشہور کر دیا جائے کہ اس میں نفرت ہی نفرت ہے۔ اسلام انسانیت کو اس کا اصل مقام دیتا ہے تو یہ عام کیا جائے کہ یہ انسانیت کے لیے خطرہ ہے۔ اسلام ملک اور وطن سے وفاداری سکھاتا ہے تو یہ عام کیا جائے کہ مسلمان ملک کے وفادار نہیں۔ کوئی بھی جھوٹ جب عام کیا جائے، اور پھر اسے بار بار دوہرایا جائے تو ذہن اسے لاشعوری طور پر ہی سہی قبول کرنے لگتا ہے۔ یہی کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ پروپیگنڈہ کے زور پر یہ معاملہ مغربی زعما نے بڑی شد و مد کے ساتھ پھیلایا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب یک بہ یک نہیں ہوا، اس کے لیے صیہونیت نے صدیوں زمین تیار کی، ماحول سازی کی، ہولے ہولے کام کیا، اور فضا کو اپنے رُخ پر موڑنے میں وہ کسی قدر کام یاب بھی ہو گئے۔ آج اس کے بہت سے نظائر دیکھنے کو ملتے ہیں، مثلاً: اب تک یہ ثابت نہ ہو سکا کہ W.T.C. کو اڑا دینے والے مسلمان تھے، 9/11 سانحہ کے ذمہ دار مسلمان تھے، تحقیقی ادارے بھی تشکیل دیے گئے مگر حتمی طور پر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ اس میں مسلمانوں کا کوئی ہاتھ تھا مگر محض پروپیگنڈہ کے زور پر پہلے ہی روز یہ کہہ دیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کا ہاتھ ہے اور محض الزام کی بنیاد پر افغان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ افغانیوں پر بم باری کی گئی۔ انسانی جانوں کو بے دریغ موت سے دوچار کیا گیا۔

بش نے کہا کہ عراق وسیع تباہی والے ہتھیار بنا رہا ہے یہ پروپیگنڈہ ثابت بھی نہ ہو سکا لیکن عراقیوں پر زبردستی جنگ مسلط کر دی گئی۔ انھیں ایسی تباہی سے دوچار کیا گیا کہ اب تک عراق بارود کے ڈھیر پر ہے اور وہاں سکون کا نام نہیں۔ ان کا کیا قصور تھا، یہی نا کہ وہ اسلام کے ماننے والے تھے، اور فلسطینی مسلمانوں کے حامی و مونس۔

برطانوی نوآبادیاتی نظام کا مقصد مغربی تہذیب کا پھیلاؤ تھا، ان کی بالادستی کا قیام تھا، معاشی استحکام اور ان کی بے پناہ قوت کا اظہار تھا، دراصل اس کا اہم مقصد اسلام کے خلاف عالمی قوت کا قیام تھا جس کی تکمیل تاجِ برطانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم میں

برطانیہ کم زور ہوگیا اور اسے اس کا اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوگیا تو اس نے اپنی سازشوں کو باقی رکھتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ہندوستان بھی آزاد ہوا۔ حکومت مسلمان سے چھین لی گئی اور دی گئی مشرکوں کو۔ یہی کچھ فلسطین میں ہوا وہاں آزادی دینے کا اعلان کیا گیا لیکن اندرونی سازش تیار کر کے یہودی اسٹیٹ عملاً قائم کر دی گئی، جب فلسطین کو آزادی دی گئی تو فوراً ہی یہودیوں نے ''اسرائیل'' کا اعلان کر دیا اور یورپ نے فوراً ہی تسلیم بھی کر لیا۔ پھر فلسطینیوں میں جذبۂ حریت جاگا۔ اسرائیل نے مظالم کیے، فلسطینی آزادی کے لیے پابہ رکاب ہوئے تو یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ فلسطینی دہشت گرد ہیں۔ شدت پسند ہیں۔ انسانیت کے دشمن ہیں۔ اسرائیل فلسطینیوں کا گھر جلائے، ان کی جان لے لے، ان کے بچوں کو مار ڈالے، انھیں زندگی کی ضروریات حتیٰ کہ پانی تک سے محروم رکھے تو کوئی عیب نہیں؟ یورپ خاموش، سپر پاور چپ، بعض مسلم ممالک بھی انھیں کی صف میں، سعودیہ وکویت اور مصر وترکی کو کوئی مطلب نہیں؟ مگر اپنے دفاع میں اگر فلسطینی ''فرسودہ'' ہتھیار اٹھالیں تو وہ دہشت گرد! انسانیت کے قاتل؟ کیا یہی ہیں زمانے میں پنپنے کی باتیں؟ کیا خونِ مسلم ارزاں ہوگیا ہے؟ آخر اس پروپیگنڈہ کا کوئی حل اب تک اسلامی دنیا نے کیوں نہ نکالا؟

دہشت گرد تو وہی ہوگا جو انسانیت کے لیے زیادہ تباہی والے ہتھیار بنائے گا۔ اس میں کون آگے ہے؟...... اسرائیل یا امریکہ؟ لیکن ان کو کوئی دہشت گرد نہیں کہتا، حالاں کہ ان کے پاس بڑی تباہی والے ہتھیار ہیں، کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیار ہیں۔ پھر بھی یہ دودھ کے دھلے ہیں؟ اس لیے کہ انھوں نے ہی غریب مسلمانوں کو پروپے گنڈے کے ذریعے بدنام کیا۔ کم زوروں کو انسانیت کے لیے خطرہ قرار دیا۔

پروپے گنڈہ کے ذریعے مسلم ذہنوں کو بھی فرسودہ کیا جا رہا ہے۔ یاد آیا ۱۱ر اکتوبر کو دہلی میں ''نوری تصوف کانفرنس'' کا انعقاد ہوا جس میں مولانا یٰسین اختر مصباحی نے اس بابت ایک واقعہ ذکر کیا تھا جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

اسلام دشمن عناصر کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق بہت سی چیزوں کا پروپے گنڈہ کر کے مسلمانوں میں فکری انتشار پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے مراکش اور الجزائر میں فرانس اور اٹلی نے مداخلت کی تو وہاں کی خانقاہوں نے اور درویشوں نے ان کے ظلم و جارحیت کا ڈٹ کر اور جم کر مقابلہ کیا، اور اس خطے میں ایک جنگ جو اور بہادر قبیلہ تھا جس کا نام ''بربر'' تھا، اس قبیلہ اور تصوف کے خلاف پوری مہم چھیڑ دی گئی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ الجزائر اور مراکش میں صوفیاے کرام اور وہاں کی خانقاہیں جو مزاحمت کر رہی ہیں ان مزاحمت کرنے والوں کو مسلمانوں کے درمیان بدنام کر دیا جائے، بربر قبیلہ جو مضبوط اور طاقت ور قبیلہ تھا اس کے خلاف اٹلی اور فرانس کے دانش وروں نے ایک منصوبے اور سازش کے تحت مہم چھیڑی، ان کو بدنام کیا کہ یہ بہت ہی وحشی اور سنگ دل لوگ ہیں، اب یہ لفظ ''بربر'' اپنی نسبت ''بربریت'' کے ساتھ ظلم اور جارحیت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، بربر جو مسلمان قبیلہ تھا فرانس اور اٹلی کا اس نے جم کر مقابلہ کیا اس کو ہم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اور بربریت کا استعمال کر کے اس کی روح کو تکلیف پہنچا رہے ہیں، یہ پروپے گنڈے کا اثر ہے۔

یوں ہی جہاد کا معاملہ لیجیے۔ یہ اسلامی احکام کا ایک مستقل گوشہ ہے جس سے انکار کسی صورت میں نہیں ہو سکتا لیکن اس کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اور ان کے پورے ہونے کے بعد ہی جہاد کی اجازت ہے۔ اب جہاد کو بدنام کرنا ہوا تو اس کے لیے پروپے گنڈہ کیا گیا، جہاں بھی کوئی لڑائی یا ذاتی نوعیت کی افتاد واقع ہوئی دھڑ سے اسے جہاد قرار دے کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اس کی آڑ میں خوب جہاد کے خلاف لکھا اور کہا گیا۔

مسلمان بھی اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ ہر رائے اور نظریہ بلا تحقیق قبول نہ کریں، بلکہ اسے اسلامی اصولوں پر پرکھ لیں، کہیں ایسا تو نہیں ہم ''تم چلو اُدھر کو ہوا جدھر کی ہے'' کے مصداق صیہونی سازشوں کا شکار ہو کر ان کی بولی بولنے لگ جائیں اور ان کے پروپے گنڈے سے متاثر ہو کر اپنے مسلمان بھائی کو ہی موردِ الزام قرار دیں۔ یہی کچھ آج ہو رہا ہے، جو لوگ اسلام مخالف قوتوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں ایسے مسلم ممالک کا حال دیکھ لیجیے انھیں مسلمانوں کے لہو کی ارزانی سے کوئی غرض نہیں، وہ یہ سوچ کر خوش ہیں کہ ان کا اقتدار تو قائم ہے، ان کی حکومت کا سورج تو نصف النہار پر ہے، انھیں تخت و تاج سے کوئی دست بردار نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ یہ وہم ہے، ان کی قوتِ فکر و عمل فنا ہو چکی ہے، جبھی تو وہ آج امریکہ و برطانیہ کے رحم و کرم پر ہیں، اور آج انھیں کی پیٹھ میں اسرائیل نے خنجر گھونپ دیا ہے یوں وہ اپنی اسٹیٹ کی توسیع میں لگا ہے اور عرب سو رہے ہیں، ضرورت بیداری کی ہے اور صیہونی پرپے گنڈے کے پروے چاک کرنے کی:

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

دعوت و تبلیغ کا نبوی اسلوب

''**بزمِ دانش**'' میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم اربابِ قلم اور علماے اسلام کو آواز دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ **از: مبارک حسین مصباحی**

جون ۲۰۱۰ء کا عنوان	اردو ادب کے فروغ میں دینی صحافت کا کردار
جولائی ۲۰۱۰ء کا عنوان	مسلم خواتین اور سیاسی قیادت

دعوت کا نبوی اسلوب اپنا کر علما اور مبلغین دعوتی انقلاب برپا کر سکتے ہیں

از: محمد طفیل احمد مصباحی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

معلمِ کائنات ﷺ کی بعثتِ طیبہ کا اہم مقصد تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ تھا۔ فریضۂ نبوت کی ادائیگی کے لیے آپ نے بے پناہ جد وجہد فرمائی اور دعوتی مشن کو کامیاب بنانے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا وہ تاقیامت بنی نوعِ انسان کے لیے نمونۂ درس ہے۔ سیرتِ طیبہ کے اس زریں باب کا مطالعہ اور اسے عملی جامہ پہنا کر علما اور مبلغین دعوتی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے نبوی اسلوب کی کچھ جھلکیاں قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں۔

اسلوبِ کلام اور عوامی نفسیات: جدید ماہرینِ تعلیم اور سائنٹفک طریقۂ تدریس کے لحاظ سے دعوت و ارشاد کے نتیجہ خیز اور مؤثر ہونے میں داعی کی زبان و بیان، اسلوبِ کلام اور اندازِ تخاطب کا اہم رول ہوا کرتا ہے۔ معلمِ کائنات ﷺ جیسا ماہر نفسیات آج تک ارضِ گیتی پر پیدا نہیں ہوا۔ ہادیِ اعظم ﷺ نے لوگوں کی تعلیم و تربیت اور دعوت و ہدایت کے لیے قرآن کی اس آیت کو اپنا رہ نما اور اصول بنایا تھا:

''ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ.'' کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے۔

مدعو قوم کا تعلق عوام و خواص اور طبقۂ مخالفین میں سے ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ حق کے متلاشی طبقۂ خواص سے آپ کی تبلیغ کا انداز یہ ہوتا کہ انھیں دلائلِ یقینیہ کی روشنی میں اسلام کی دعوت دیتے۔ ضدی، ہٹ دھرم اور تکبر مزاج لوگوں کو ہمیشہ رفق و نرمی اور سنجیدہ اسلوب میں تعلیم دیتے، جب کہ طبقۂ عوام کو مواعظ حسنہ یعنی سہل اور آسان پیرایۂ بیان میں تعلیم دیتے جس سے متاثر ہو کر وہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا۔ (انسانِ کامل، ص: ۲۷۳، از محمد بن علوی مالکی علیہ الرحمہ)

قول و عمل میں یکسانیت: ارشادِ باری تعالیٰ: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ.'' کے مطابق آپ کی زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی۔ قول و عمل میں یکسانیت آپ کی حیات کا جزوِ لاینفک تھی۔ جس چیز کا حکم دیا، پہلے اس پر عمل کر کے خود دکھایا۔ جہاد کا حکم ہوا تو ۲۸ر غزوات میں صحابۂ کرام کے دوش بدوش نظر آئے۔ جنگِ احد میں زخمی ہوئے، معرکۂ خندق میں پیٹ پر پتھر باندھے نظر آئے۔ عبادتِ خداوندی کا آوازہ بلند کیا تو خود راتوں رات عبادتِ الٰہی اور تہجد میں گزاری۔ صدقات و خیرات کی تعلیم دی تو عملاً برت کر دکھایا۔ جو مال و دولت ہاتھ

میں آتا اسے راہِ خدا میں خرچ کر دیتے۔ فقرا و مساکین پر کثرتِ تصدق کے سبب گھر میں چولہا نہیں جلتا، اور بسا اوقات کھجور اور پانی پر گزارا کرتے۔ دعوت و تبلیغ کی اہمیت و افادیت سے لوگوں کو روشناس کیا تو خود آپ کا عالم یہ تھا کہ دن بھر تبلیغ کرتے، مسجدِ نبوی کے چبوترے (صفہ) میں متلاشیانِ علم صحابۂ کرام کو علم و حکمت کے چشمۂ زلال سے سیراب کرتے۔ غرض کہ آپ ﷺ کی زندگی کے جس گوشے پر نظر ڈالی جائے، آپ کی ذات قول و عمل کی باہمی امتزاج کی پیکر نظر آتی ہے۔

آج ہماری دعوت و تبلیغ غیر موثر کیوں ہے؟ اس کی ایک اہم وجہ قول و عمل میں یکسانیت کا فقدان ہے۔ اسلام و سنیت کی نمائندگی کرنے والے ہمارے مبلغین کو اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا ورنہ........

سوال و جواب کا طریقہ: وعظ و نصیحت اور تعلیم و تدریس کے وقت سوال و جواب اور غیر تام جملہ ارشاد فرما کر حاضرین کے تجسس کو بیدار کرتے، کیوں کہ سامعین جب تک ہمہ تن متوجہ نہ ہوں، ان کے سامنے حکمت و دانائی کی باتیں فضول ہیں۔ گویا یہ اس کہاوت کے مثل ہے "بھینس کے آگے بین بجانا"۔ دعوت و تبلیغ اور وعظ و ارشاد کے وقت خود سوال کر کے اس کا جواب دینا آپ کی عادتِ کریمہ تھی۔ ایک مرتبہ سوال کیا کہ، کیا میں تمھیں ایسا کام نہ بتادوں جس پر عمل پیرا ہو کر تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ پھر خود جواب ارشاد فرمایا: "افشو السلام بینکم." "کہ اپنے درمیان سلام کو فروغ دو، یہ باہمی الفت و محبت کا اہم ذریعہ ہے۔

ایک موقع پر فرمایا: امر کے سر، کھمبا اور اس کے کوہان کے متعلق تمھیں آگاہ نہ کروں؟ پھر از خود جواب دیا: "راس الامر اسلام ہے، اس کا کھمبا نماز اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔" (انسانِ کامل، ص: ۴۰۰)

عام فہم زبان کا استعمال: حضور سید عالم ﷺ بہت صاف، سادہ، عام فہم، سلیس اور شستہ زبان استعمال فرماتے۔ اگر کوئی دورانِ تعلیم زبانِ نبوت سے ادا ہونے والے الفاظ و حروف کو گننا چاہتا تو وہ آسانی سے گن لیتا۔ مرصع و مسجع عبارت بولنے اور پر تکلف زبان استعمال کرنے سے گریز کرتے۔ سادگیِ بیان کے باوجود آپ کی زبان فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہوتی۔ فصحاے عرب ایک بار آپ کی گفتگو سن لیتے تو اپنی زبان دانی بھول جاتے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں: "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم." "آپ کو "جوامع الکلم" کا معجزہ عطا ہوا تھا کہ کم سے کم الفاظ میں معانی و بیان کا سمندر سمو دیتے۔

اشارات و کنایات اور نبوی تمثیلات: آپ کی فطرتِ طیبہ میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی، جس بات کا تفصیل سے ذکر کرنا حیا اور شائستگی کے خلاف ہوتا، اسے اشاروں اور کنایوں میں بیان فرما دیتے۔ ایک عورت سے ارشاد فرمایا کہ تم بعدِ طلاق شوہرِ سابق کے پاس اس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک کہ ایک دوسرے کے شہد کو چکھ نہ لو۔ یہاں آپ نے شہد کے چکھنے سے "جماع" اور "وطی" مراد لیا ہے۔ اسی طرح ایک حائضہ عورت سے فرمایا کہ تم روئی سے پاکی حاصل کرو۔

اسی طرح آپ تمثیلات اور حسی مثالوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات لوگوں تک پہنچا دیتے، مثلاً: "الحسدُ یاکل الحسناتِ کما تاکل النارُ الحطب." "کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔ اسی طرح جس دل میں حصۂ قرآن نہ ہو اس دل کو آپ نے ویران گھر سے تشبیہ دی ہے جس سے مسئلہ کی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنا، سیکھنا اور اسے یاد کرنا در اصل اپنی باطنی دنیا کو آباد کرنا ہے۔ چناں چہ آپ ارشاد فرماتے ہیں: "ان الذی لیس فی جوفہ شی من القرآن کالبیت الخرب." (مشکوۃ شریف)

دعوت و تبلیغ کے مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ایک حاذق طبیب اور ماہر نفسیات کا آپ نے رول ادا کیا، جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ درس گاہِ نبوت کے تعلیم یافتہ افراد اپنے وقت کے ایسے بے مثال معلم ثابت ہوئے کہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

ترغیب و ترہیب اور اعادہ و تکرار: پند و نصیحت اور تعلیم و ارشاد کے لیے جب منبرِ اقدس پر تشریف لاتے تو جہاں ترغیب و تبشیر اور فضائلِ اعمال سے متعلق باتیں بتا کر حاضرین میں خوشیوں کی لہر دوڑا دیتے، وہیں ترہیب اور آخرت کے ہول ناک عذاب کے واقعات سنا کر سامعین پر کپکپی بھی طاری کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے دلوں میں گناہ کا خیال تک نہ لاتے۔

بوقتِ ضرورت کلام کو دوبارہ، سہ بارہ ذکر کرتے اور الفاظ صاف صاف ادا کرتے تاکہ ہر قسم کی باتیں لوگ آسانی سے سن سکیں اور انھیں اچھی طرح اپنی یادداشت کے خزانے میں محفوظ رکھ سکیں۔ آج خطبا اور مبلغین صرف ترغیب و تبشیر اور فضائلِ اعمال سے متعلق احادیث ہی بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جس کا نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ بھولے بھالے عوام میں عمل کا جذبہ مفقود ہے۔ وہ فضائل کی حدیث سن کر پھولے نہیں سماتے۔ بزرگوں کی کرامات اور دوسرے من گڑھت واقعات تو انھیں خود یاد رہتے ہیں لیکن اگر ان سے وضو کے فرائض، شرائط نماز اور دیگر ضروری مسائل پوچھ لیے جائیں تو "تنگ تنگ دیدم، دم نہ کشیدم" والا منظر نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ دعوتی پہلو قرآن کریم کے اسلوبِ دعوت کے عین مطابق ہے، کیوں کہ قرآن نے جہاں کہیں ہمیں جنت اور اس کی آسائشوں کی بشارت سنائی ہے وہیں جہنم کی ہول ناکیوں کا بھی دل سوز منظر پیش کیا ہے۔

وعظ و خطابت کا انداز: مختصر اور جامع خطبہ ارشاد فرماتے، موقع و محل کی مناسبت سے آواز میں اتار چڑھاؤ اور سوز و گداز ہوتا، جسم کی حرکات و سکنات، چہرے، بشرے اور آنکھوں سے آپ کے قلبی تاثر کا پورا اظہار ہوتا۔ صحابۂ کرام کے اندر ایثار و قربانی اور حسنِ عمل کی روح پھونکنے میں آپ کے خطبات کو بھی بڑا دخل تھا۔ جب کوئی مسئلہ یا اسلامی تعلیمات بتانا مقصود ہوتا تو یک بارگی تمام مسائل پیش کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا بیان فرماتے تاکہ کہیں لوگ اکتا نہ جائیں۔ مسلسل خطاب اور تقریر کرنے سے اجتناب برتتے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کبھی کبھی وعظ فرماتے تھے تاکہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔ (انسانِ کامل، ص: ۴۰۱)

تبلیغ رسالت کے چند نمایاں اسالیب: کبھی کبھی ریت پر نشانات بنا کر اپنا مدعا ظاہر کرتے، انگلیوں کے اشارے سے مطلب واضح فرماتے۔ چناں چہ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا: "انا و کافل الیتیم کھاتین." "یعنی آپ نے بیچ والی اور شہادت والی انگلی کو باہم ملا کر ارشاد فرمایا کہ ہم اور یتیموں کی پرورش کرنا والا انسان جنت میں ایک دوسرے سے اسی طرح قریب رہیں گے جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے سے قریب ہیں۔

گزشتہ اقوام اور ماضی کے عبرت انگیز واقعات سے حصولِ مقصد میں مدد لیتے۔ کسی شے کی ضد سے مقابلہ کر کے اس کے فرق کو واضح کرتے۔ ایجاز و اختصار آپ کے کلام کا طرۂ امتیاز تھا۔ جس شخص کا تعلق جس قبیلے سے ہوتا اسی کی زبان اور لہجے میں گفتگو فرماتے، جیسا کہ ایک بار آپ نے اپنی زبان سے یہ جملہ ارشاد فرمایا: "لیس من امبر امصیام امسفر." "یعنی "لام" کی جگہ آپ نے "م" ارشاد فرمایا، کیوں کہ اس قبیلے کا اسلوبِ کلام یہی تھا۔ جس کا مفہوم ہے: "حالتِ سفر میں روزہ یہ نیکی نہیں۔"

آپ کی تبلیغ کی سب سے بڑی خصوصیت حسنِ اخلاق اور صبر و تحمل تھا، جس نے بڑی بڑی مغرور پیشانیوں کو بارگاہِ نبوت میں جھکا دیا اور جھوٹے معبودوں کی پرستش کرنے والوں نے اپنے مصنوعی خداؤں کی دہلیز سے منہ موڑ کر بارگاہِ رب العزت میں اپنی گردنیں جھکا دیں۔

محترم قارئین! یہ تھے حضور کے وہ دعوتی اوصاف اور تبلیغی اسالیب جن کے سبب ایک قلیل مدت میں ایک ایسی جماعت سرزمین عرب سے اٹھی جو دیکھتے دیکھتے اقوامِ عالم پر چھا گئی۔

ٹی. وی. عصر حاضر میں دینی دعوت کا مؤثر ترین ذریعہ

از: محمد ناصر حسین مصباحی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو ہر زمانے کے انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو بھی ہمہ گیر و ہمہ جہت بنایا اور آپ ﷺ کو منصبِ نبوت و رسالت پر اس اعزاز کے ساتھ فائز کیا ہے کہ آپ کا زمانۂ نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔ آپ آخری نبی ہیں آپ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، آپ پر نازل ہونے والے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اپنے ذمہ کرم پر لی ہے اور آپ کی رسالت کے دائرہ کار کو تمام انسانوں تک بڑھایا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ بسیں حتیٰ کہ آپ کی رسالت کو تمام عالمین اور ان میں رہنے والی تمام تر مخلوقات کے لیے بنایا ہے۔ غرضے کہ اس کائنات کی کوئی بھی چیز آپ کی رسالت کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہے۔ آپ کی رسالت اس کائنات کی تمام چیزوں کو محیط ہے۔

اس تناظر میں جب ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا اسوہ حسنہ دیکھتے ہیں تو آپ کا عمل ہمارے لیے ایک مینارہ نور کی طرح زندگی کے تمام شعبوں میں راہنمائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جب زندگی کا ہر شعبہ ہی حضور نبی اکرم ﷺ کے عمل سے روشنی پا رہا ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دعوت کا شعبہ آپ کے عظیم عمل کی روشنی سے محروم ہو جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم کے مطابق لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کے لیے جس عمل سے اس عظیم مقصد کی ابتدا کی اسے دعوت ہی تو کہتے ہیں۔ آپ کی حیات اقدس میں دعوت کے وہ تمام اسالیب موجود ہیں جو فی زمانہ دعوت میں رائج رہے ہیں یا آنے والے زمانے میں دعوت میں رائج ہوں گے، ہر دعوت کی اصل حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات میں موجود ہے۔

دعوت کے نبوی اسلوب: اسلوب سے مراد دعوت و تبلیغ کا طریقہ کار ہے۔ دینی دعوت و تبلیغ کے متعدد اور متنوع طریقے ہیں۔ جو مبلغین اور عوام کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات دعوت کا ایک انداز کسی انسان پر موثر ہوتا ہے جبکہ دوسرے انسان پر موثر نہیں ہو پاتا۔ تبلیغ کا ایک طریقہ ایک دور میں بہت اثر انگیز ہوتا ہے جبکہ دوسرے دور میں وہی طریقہ کارگر نہیں ہوتا۔ چناں چہ ایک مبلغ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان امور کو ملحوظ رکھے۔

جہاں تک دعوت کے نبوی اسالیب کی بات ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک طریقہ دعوت نہیں بلکہ آپ نے دعوت کے متعدد طرق کو اختیار کیا ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

حکمت وموعظہ حسنہ: "حکمت اور موعظہ حسنہ" اصلاح معاشرہ کے دو بنیادی اصول ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین (النحل: ۱۲۵)

ترجمہ: اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلایئے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کیجیے جو سب سے بہتر ہو۔

"حکمت وموعظت" کے متعدد معانی ہیں۔ حکمت کا ایک معنی یہ ہے کہ داعی اپنے موقف کی صداقت پر ایسی دلیل پیش کرے جس سے سامع کے دل سے شکوک وشبہات دور ہو جائیں اور مسئلہ کی حقانیت واضح ہو جائے، اور "موعظت" کا معنی یہ ہے کہ ایسی خیر وبھلائی کی بات کہی جائے جو سامع کے دل میں گھر کر جائے۔

اصلاح کے لئے مخاطبین کی ذہنی سطح، رجحانات اور تقاضوں کی رعایت: دعوتِ دین اور اصلاح معاشرہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھی ہمارا مخاطب ہے ہم اس کی نفسیات، اس کی ذہنی سطح، اس کی طبیعت، رجحان اور ذوق کو ملحوظ رکھیں، اس کی خرابی کی نہج کو سامنے رکھیں کہ اس کے تقاضے کیا ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں روایت ہے ایک اعرابی مسجد نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور اس کے صحن میں پیشاب کر دیا، اس وقت حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوڑے کہ ان کو سختی سے منع کریں، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روک لیا اور فرمایا کہ تمھیں آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے نہ کہ تنگی پیدا کرنے کے لیے، پھر حضور اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس پر پانی بہا کر صاف کر دیں، (صحیح بخاری: حدیث نمبر: ۲۲۰)

قابل غور بات یہ ہے کہ اس موقع پر حضور اکرم ﷺ نے اس اعرابی کو شرمسار نہیں کیا بلکہ کمال شفقت ومحبت سے فرمایا کہ یہ اللہ کا گھر ہے یہاں نماز وتلاوت ہوتی ہے، یہاں گندگی کرنا اس کے تقدس کے خلاف ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ سے یہ حقیقت واضح ہے کہ آپ کی دعوت، مخاطبین کی ذہنی سطح، رجحانات اور تقاضوں کے مطابق ہوتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ سے ایک صحابی نے سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ! اسلام میں سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "نماز اپنے وقت پر ادا کرنا"۔ دوسرے صحابی نے بھی یہی سوال کیا کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ اس پر حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی سربلندی کیلئے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔ یہی سوال ایک اور موقع پر کسی صحابی نے کیا اس پر حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ اسی طرح کسی اور صحابی نے سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: کھانا کھلانا سب سے بڑی نیکی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں کیا جانے والا سوال تو ایک ہے مگر جواب مختلف قسم کے ہیں، یہ اصلاح کا حکیمانہ نبوی اسلوب ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پہلے سوال کی نوعیت اور سائل کے نفسیات کو پیغمبرانہ فراست سے جان لیا کہ سوال کرنے والے کے اندر کمزوری یہ ہے

کہ یہ نماز اپنے وقت پر ادا نہیں کرتا۔ سوال کرنے والے کو وہی جواب دیا جو اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

یہی سوال جب دوسرے صحابی نے کیا تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے احوال اور نفسیات کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ انہیں جان قربان کرنے سے ڈر لگتا ہے، انکے جواب میں فرمایا کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا سب سے بڑی نیکی ہے۔ تیسرے کے نفسیات کا جائزہ لیا کہ وہ ماں باپ کی خدمت میں زیادہ اہتمام نہیں کرتے ان سے فرمایا کہ ماں باپ کی خدمت وادب کرنا سب سے بڑی نیکی ہے۔ چوتھے سائل کے نفسیات کا جائزہ لیا کہ وہ ضیافت کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے، انکے جواب میں فرمایا، کھانا کھلانا سب سے بڑی نیکی ہے۔

اسی طرح متعدد مواقع پر کئے جانے والے ایک ہی نوعیت کے سوال کا جواب سائلین کی ضروریات اور حاضرین کے حالات اور تقاضوں کے مطابق مختلف اعمال خیر تلقین کر کے فرمایا، جن میں سے ہر عمل یقینا اللہ کے ہاں محبوب ترین ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی حکیمانہ دعوت واصلاح کا اثر تھا کہ جس نے دنیا کے بگڑی ہوئے سماج کی کایا پلٹ دی۔

تبلیغ کا معاوضہ طلب نہ کرنا: یہ تمام انبیاے کرام ورسولانِ عظام علیہم التحیۃ والثنا کا طرہ امتیاز تھا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ویاقوم لا اسالکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللہ (ھود: ۲۹) "اے میری قوم میں تم سے اس (تبلیغ) پر مال نہیں مانگتا میرا اجر نہیں مگر اللہ پر۔"

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ازھد فی الدنیا یحبک اللہ وازھد فیما فی ایدی الناس یحبوک (سنن ابن ماجہ حدیث: ۴۲۴۱) "دنیا سے بے نیازی کرو تو اللہ تمہارے ساتھ محبت کرے گا اور لوگوں کی چیزوں سے بے نیاز ہو جاؤ تو لوگ تمہارے ساتھ محبت کریں گے۔"

داعی حق کے لیے لازمی ہے کہ وہ آخرت کی کامیابی کو دنیا پر ترجیح دے اور لوگوں کی چیزوں سے امیدیں وابستہ نہ کرے۔

نرم اسلوب اختیار کرنا: اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے ارشاد فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ. اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرمی کرنے والے ہیں۔ اگر آپ بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔ (آل عمران: ۱۵۹)

اس سے معلوم ہوا کہ جو مبلغین لوگوں سے سختی کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔ اور بہت زیادہ تعصب سے کام لیتے ہیں وہ تبلیغ کرنے میں انبیا علیہم السلام کے طریقہ پر نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ. بے شک اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ (صحیح البخاری: حدیث ۶۰۲۴)

اسی طرح فرمان نبوی ﷺ ہے: ان الرفق لا یکون فی شی الا زانہ ولا ینزع من شی الا شانہ۔

جس معاملے میں نرمی ہو وہ اسے مزین کر دیتی ہے اور اگر نرمی نکل جائے تو اسے بد نما کر دیتی ہے۔ (مسلم حدیث نمبر: ۶۷۶۷)

مجمع شناسی وموقع شناسی: مبلغ کے لیے لازمی ہے کہ وہ مجمع شناس ہو، سامعین کی علمی اور ذہنی استعداد کے مطابق گفتگو کرے

حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ۔

لوگوں کی معرفت کے مطابق ان سے گفتگو کرو (وگرنہ) کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے۔ (بخاری حدیث نمبر: ۱۲۷ باب من خص بالعلم)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ما انت بمحدث قوما حدیثا لا تبلغہ عقولھم الا کان لبعضھم فتنۃ۔

اگر تم کسی قوم کی ذہنی استعداد سے بالا گفتگو کرو تو ان میں سے بعض فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔" (مسلم حدیث: ۱۴)

تالیف قلبی: مبلغ کا فرض ہے کہ وہ عوام کی تالیف قلبی کے لیے ہاتھ کھلا رکھے اور اپنے اثر ورسوخ کے ساتھ ان کے مسائل اور معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہے کیونکہ اس طرز عمل کا لوگوں پر بہت بڑا اچھا اثر پڑتا ہے ویسے بھی کرم نوازی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ اللہ تعالیٰ کریم کرم کو پسند کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے کہ آپ ﷺ کس قدر غرباء اور نادار افراد اور نو مسلموں کے ساتھ خلق عظیم کا برتاؤ فرماتے تھے۔

لوگوں سے میل جول: لوگوں سے میل جول رکھنا اور خود ان کے پاس چل کر جانا اور انہیں دعوت اسلام دینا خود نبی اکرم ﷺ کا اسوہ

حسنہ ہے۔ آپ ﷺ موسم حج میں بالخصوص اور عام دنوں میں بھی مکہ مکرمہ میں آنے والے عرب وفود سے ملاقاتیں کرتے اور ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کرتے تھے کیونکہ دینی دعوت کی مثال باران رحمت جیسی ہے جو ہر جگہ دوست اور دشمن پر برستی ہے۔

اعلانیہ دعوت: حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی قوم قریش مکہ کو جب دعوت اسلام دی تو آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے اپنی قوم کے رواج کے مطابق سارے اہل مکہ کو صدا دی، سب آپ کی پکار سن کر وہاں پہنچ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا اے قوم سنو! اگر میں تم کو یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر جرار آرہا ہے اور تم پر وہ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ تو کیا تم میری بات پر یقین کر لوگے۔ قوم نے بیک زبان، ایک آواز کے ساتھ پکارتے ہوئے کہا کیوں نہیں! آپ تو الصادق الامین ہیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم سے کہا کہ جب تم مجھے اس بات میں سچا مانتے ہو تو اس بات میں بھی سچا مان لو کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ اکیلا ہے، یکتا ہے اور کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، وہی معبود حقیقی ہے، وہی عبادت و پرستش کے لائق ہے کسی اور کی عبادت جائز نہیں ہے۔ اے اہل مکہ اس ذات حق پر ایمان لے آؤ۔

تفصیل سے قطع نظر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے سارے مکہ والوں کو بلایا، ہر کسی تک یہ آواز پہنچی، عرب کے دستور کے مطابق ہر کسی نے نہ صرف اس آواز کو سنا بلکہ اس پر لبیک کہتے ہوئے خود بنفس نفیس حاضر بھی ہو گیا۔ سیرۃ الرسول کے اس عمل کی روشنی آج ہماری زندگیوں میں کیسے ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے یقیناً وہ عمل اور طریق دعوت جو حضور نبی اکرم صلی ﷺ کے اس طریق دعوت سے مشابہت رکھتا ہے آج امت مسلمہ کو اختیار کرنا ہوگا تاکہ دعوت عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے موثر ہو سکے، چنانچہ اس حوالے سے اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے موجودہ دور کے طریقے ہیں جن کے ذریعے پوری قوم تک بیک وقت اپنی آواز پہنچائی جا سکتی ہے، تھوڑے سے وقت میں ساری قوم، ہماری دعوت سے مستفید ہو جائے اور ہماری دعوت کی آواز ہر کسی تک آسانی سے پہنچ جائے، اور کوئی بھی ہماری دعوت کی آواز سے محروم نہ رہے۔ آج جدید ذرائع میں سے متعدد آلات و طریقے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

TV کے ذریعے دعوت: آج کے جدید ذرائع دعوت میں سے لاکھوں، اربوں لوگوں تک پنی دعوت پہنچانے کے لئے TV کا ذریعہ اختیار کیا جارہا ہے۔ آپ دنیا کے کسی کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر اپنی آواز ریکارڈ کرادیں۔ مطلوبہ آلات کے ذریعے ریکارڈ کی گئی آپ کی آواز نہ صرف محفوظ کر لی جائے گی بلکہ اسے دنیا بھر کے لوگوں تک TV کے ذریعے پہنچایا بھی جا سکے گا، دین کی دعوت کا عصر حاضر میں یہ ایک موثر ترین طریقہ ہے۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ دعوت: عصر حاضر میں انٹرنیٹ بھی دعوت، تبلیغ کا بہت اہم ذریعہ ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انٹرنیٹ کے ذریعہ دین اسلام کی بات پہنچائی جا سکتی ہے۔ مگر افسوس اس بات کا کہ ہمارے یہاں دعوت و تبلیغ کے لیے اس کا استعمال نہ کے برابر ہے، غیر مقلدین وہابیہ اور دیابنہ نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ انھوں نے اپنے باطل مذہب کا پرچار خوب کیا۔ آج جب ہم انٹرنیٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسلامیات سے متعلق کچھ ڈھونڈھتے ہیں تو ہمیں پورا انٹرنیٹ وہابیت زدہ معلوم ہوتا ہے۔ اور مشکل سے بڑی تلاش کے بعد کوئی سنی سائٹ ملتی ہے۔

مذکورہ جدید ذرائع کا استعمال دعوت کے عمل کو مؤثر بنانے کے لیے ازحد ناگزیر ہے، اگر ہم نے ان کے استعمال سے انحراف کرتے رہے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کے نام پر وہابیت، دیوبندیت، نیچریت، شیعیت کا خوب پرچار ہوگا اور حقیقی اسلام دنیا نابلد رہ جائے گی۔ کیوں کہ ظاہر ہے آج بیرون ہند ماڈرن مسلم یا غیر مسلم ممالک کے لوگ دین اسلام کی بات سننے کے لیے کسی محفل یا مجلس میں آنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے خصوصاً جب کہ TV چینل کے ذریعہ اسلام کی بات خود ان کے گھر پہنچائی جارہی ہو۔ اس لیے ہمیں سنجیدگی سے دین اسلام کے اس فریضہ کی بہتر ادائگی کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اور جدید آلات کو استعمال کر کے منہاج نبوت پر اپنی دعوت و تبلیغ کو زیادہ سے زیادہ مؤثر و فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا، ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسلام کی عملی زندگی کا نمونہ بنے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کا تعارف اچھے طریقے سے کرائے۔ اگر آج امت مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالے تو وہ سب بیماریاں ختم ہو جائیں گی جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، صحابہ کرام کی کامیابیوں کا راز یہی تھا کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کا مقصد مخلوق خدا کی اصلاح و ترتیب کو بنالیا تھا ،اس جماعت کا ہر فرد اسلام کا نمونہ کامل تھا اور خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

مسلمانوں میں تبلیغ: دعوت دین کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے۔ تمام مسلمانوں کو ضروریات دین سے واقف کر دیا جائے۔ امت مسلمہ میں علوم قرآن و سنت کے ماہرین پیدا ہوں اور دین خالص کی روشنی میں غیر اسلامی نظریات اور رسوم باطلہ و خیالات فاسدہ کو مٹایا جائے۔ احیائے

گوشۂ ادب

مثنوی معنوی اور فلسفیانہ مسائل

مہتاب پیامی

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

طالب حکمت شو از مرد حکیم　　تا از و گردی تو بینا و علیم

(مثنوی معنوی ج1/ص134)

یعنی شیخ کامل کی تربیت سے فیض حاصل کرتا کہ تو صاحب بصیرت اور عالم بنے اور آج تک دنیا اس شیخ کامل (مولانا روم) سے کسب فیض کر رہی ہے۔ مثنوی کا ایک ایک شعر اپنے اندر سیکڑوں جہانِ حکمت و دانائی سمیٹے ہوئے ہے۔ مثنوی کی عظمت کے اعتراف میں صرف یہی ایک شعر کافی ہوگا کہ ؎

مثنویِ مولویِ معنوی　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مثنوی "قرآن" تو نہیں ہے لیکن قرآنی علوم کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ جہاں اس میں قرآنی آیات کی تفاسیر آسان اور قابلِ فہم حکایات کے ذریعہ پیش کی گئی ہے وہیں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کا خزانہ بھی ہے۔ اور تصوفانہ مسائل کے ذکر کے ساتھ اس میں فلسفیانہ مسائل کی توضیح بھی نظر آتی ہے۔ مولانا کا مقصد اگرچہ فلسفیانہ مسائل کو بیان کرنا نہیں ہے لیکن امثال و حکایات میں ضمناً جو مسائل آگئے ہیں ان کی وضاحت فرمادی ہے۔ فلسفیانہ مسائل اگرچہ کم ہیں لیکن چھ دفتروں پر مشتمل مثنوی میں جا بہ جا بکھرے ہوئے یہ مسائل اتنے بھی کم نہیں ہیں کہ انھیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ راقم الحروف نے زیر نظر مقالے میں مثنوی کے فلسفیانہ مسائل کی صرف نشاندہی کی ہے، البتہ محققین کے لیے یہ ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

مسئلۂ ارتقا: -ڈارون (Darwin) کا نظریۂ ارتقا یہ ہے کہ پہلے جماد تھا، اس سے نبات کا وجود ہوا اور نباتات سے حیوانات کی پیدائش ہوئی۔ جدید علمِ سائنس اسے "ڈارون کا نظریۂ ارتقا" سمجھتا ہے۔ لیکن ارتقا کا یہ نظریہ چارلس ڈارون کی ایجاد نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے سے مفکرین اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ارتقا کے ان حامیوں میں ہیراکلیٹس (Heraclitus) 480 540ا اناکسی مینڈر (Anaksimender) -546 610ق.م. ،سینٹ آگیسٹن (430-354) سرِ فہرست ہیں۔ لیکن ڈارون سے بہت پہلے اس نظریہ کی تفصیل مولانا روم نے پیش فرما دی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

آمده اول به اقلیمِ جماد　　وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد　　وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد　　نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہما میلے کہ دارد سوئے آں　　خاصہ در وقتِ بہار و ضیمران
ہمچو میلِ کودکاں با مادراں　　سرِ میلِ خود نداند در لباں
باز از حیواں سوئے انسانیش　　می کشد آں خالقے کہ دانیش
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت　　تا کشد اکنوں واقل ودانا و زفت

(مثنوی معنوی ج4/ص45-344)

دنیا کی موجودات کو چار قسموں پر تقسیم کیا جاتا ہے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان۔ ان میں بحث اس بات کی ہے کہ یہ چاروں قسمیں ابتدائے تخلیق سے ہیں یا صرف ایک چیز پیدا کی گئی تھی ،اس نے ترقی کر کے چار رخ اختیار کر لیے۔ مولا فرماتے ہیں کہ روح پہلے جمادات کے خطے میں تھی، پھر ترقی کر کے نباتات کے خطے میں آئی اور عرصۂ دراز تک وہیں رہی لیکن اپنی جمادی حالت سے بے خبر۔ بعد میں حیوانی خطے میں داخل ہوئی تو اپنے نباتی دور کو بھول گئی۔ البتہ اتنا ہوا کہ موسمِ بہار میں اس کا میلان نباتات کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ پھر یہ روح حیوانیت سے انسانیت کے مرتبے پر پہنچی۔ غرض اقلیم در اقلیم سفر کرتی ہوئی وہ عقل و دانائی کے مقام و مرتبے پر فائز ہوگئی۔

علامہ اقبال نے اپنے مشہور زمانہ خطابت میں مولانا روم کے تصور ارتقا کو اس طرح دوہرایا ہے۔

Is Religion Possible? The formulation of

payamee@gmail.com

the theory of evolution in the world of Islam brouht in to being Rumi,s tremendous enthusiasm for biological future of man. No cultured muslim can read such passages as the following without Thrill of joy.

(بہ حوالہ تاریخ عالم از: اخلاق احمد قادری۔ ص 21 فرید بک ڈپو دہلی، ایڈیشن 2006ء

مولانا شبلی نعمانی کے خیال میں مولانا روم ڈارون سے بہت پہلے اسی نظریۂ ارتقا کے قائل تھے، اگر چہ مولانا روم کے یہ اشعار بہ صراحت بتا رہیں کہ وہ انسان کی ابتدائی خلقت جمادی مانتے ہیں جس سے ترقی کر کے اس نے جسمِ نباتی اختیار کیا۔ پھر جسمِ نباتی سے جسمِ حیوانی اور جسمِ حیوانی سے جسمِ انسانی بنا۔

درج بالا اشعار کا پیش منظر تو وہی ہے جو درج بالا سطور میں مذکور ہے، البتہ ان کا پس منظر کسی اور جانب اشارہ کرتا نظر آ رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

از جماده مردم و نامی شدم وز نما مردم بحیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم کے زمردن کم شدم

(مثنوی معنوی ج 3 / ص 372)

یعنی میں جمادیت سے مرا اور نباتی بن گیا اور نباتیت سے مرا اور حیوان بن گیا، میں حیوانیت سے مرا اور انسان بن گیا۔ تو میں کیا ڈروں، میں مرنے سے کب گھٹا۔

ذرا آپ مادّے کی ساخت اور اس کے تغیرات پر غور کیجیے، نباتات اپنی غذا جمادات سے حاصل کرتی ہیں، مثلاً کوئی بھی پیڑ یا پودا اپنی خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے اور زمین کا وجود جمادی ہے، جب کہ پیڑ کی جڑیں زمینی (جمادی) اجزا کو اپنی خوراک بناتی ہیں، وہ اجزا اپنی جمادیت ترک کر کے نباتیت اختیار کر لیتے ہیں، یعنی پیڑ پودوں کا جز بن جاتے ہیں۔ پھر حیوان اپنی غذا نباتات سے حاصل کرتا ہے تو نباتی اجزا حیوانی اجزا میں منتقل ہو کر حیوانی جز بن جاتے ہیں، پھر انسان اپنی غذا اجزائے حیوان سے حاصل کرتا ہے تو وہ اجزائے حیوانی اپنی حیوانیت چھوڑ کر انسانی جسم کے جز بن جاتے ہیں۔

یہاں اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہمارے دانش وروں کا خیال ہے کہ ''ڈارون کا نظریۂ ارتقا'' مولانا روم کا ''نظریۂ ارتقا'' ہے اور وہ اسی کے قائل ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ ڈارون نے اپنا نظریۂ ارتقا مولانا روم سے ضرور حاصل کیا ہے لیکن وہ اس کی روح تک نہیں پہنچ سکا اور صرف لفظی مفہوم کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ اصل میں مولانا روم صرف اور صرف ''انتقالِ اجزا'' کے قائل ہیں ''انتقالِ وجود'' کے نہیں اور ڈارون سے یہی غلطی ہوئی کہ اس نے ''انتقالِ اجزا'' کو ''انتقالِ وجود'' سمجھ لیا اور آج ایک دنیا اس کے نظریے کی قائل ہے، جب کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ اسی طرح ہندو قوم میں جو آواگمن کا نظریہ ہے وہ بھی دراصل اسی نظریۂ ارتقا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

فلسفۂ وجود:- ایک مشہور مقولہ ہے: ''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے''، کسی چیز کی ضرورت ہی ایجادات و اختراعات کا سبب بنتی ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو اس کائنات کا، ثوابت و سیار کا، ماہ و انجم کا، اس عالمِ رنگ و بو کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ کائنات میں جہاں جس چیز کی ضرورت ہے وہاں وہ اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ حاضر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

زاں کہ بے حاجت خداوندے عزیز می نہ بخشد ہیچ کس را ہیچ چیز
گر نبودے حاجتِ عالم زمیں نافریدے ہیچ رب العالمیں
ویں زمینِ مضطرب محتاجِ کوہ گر نبودے نافریدے با شکوہ
ور نبودے حاجتِ افلاک ہم ہفت گردوں نافریدے از عدم
آفتاب و ماہ و ایں استارگاں جز بحاجت کے پدید آمد عیاں
پس کمندِ ہستہا حاجت بود قدر حاجت مرد را آلت بود

(مثنوی معنوی ج 2 / ص 308)

یعنی دنیا میں خداوند عزیز کسی کو کوئی شے بے حاجت عنایت نہیں فرماتا۔ مثلاً اگر کائنات میں زمین کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے اللہ تعالیٰ کبھی پیدا نہ فرماتا، اور اگر لرزتی کانپتی زمین کو استحکام کے لیے پہاڑوں کی ضرورت نہ ہوتی تو یہ پر شکوہ پہاڑ پیدا نہ فرماتا، اگر آسمانوں کی ضرورت نہ ہوتی تو عدم سے سات آسمان پیدا نہ فرماتا۔ سورج چاند اور ستارے ضرورت کے بغیر کب نمودار ہوتے ہیں تو موجودات کی کمند ضرورت ہے، بہ قدر ضرورت انسانوں کے لیے سامان ہوتا ہے۔

یعنی زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا وغیرہ عالم کی تمام چیزیں ضرورت کے تحت پیدا کی گئی ہیں۔ مثال

کے طور پر آپ دھول کو لیجیے، بہ ظاہر تو یہ بلا ضرورت نظر آتی ہے مگر بہ باطن دھول اور غبار کا وجود حیاتِ انسانی اور بقائے نسلِ انسانی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ دھول کے لا تعداد ذرات فضاؤں میں تیرتے رہتے ہیں اور یہ ذرات سورج سے خارج ہونے والی بنفشی شعاعوں (Altra Violet Rays) کو سطحِ زمین تک آنے سے روکتے ہیں۔ سورج سے خارج ہونے والی یہ بنفشی شعاعیں اگر سطحِ زمین پر پہنچ جائیں تو زمین صرف ایک جلے ہوئے کوئلے کی صورت میں باقی بچے۔ ایک دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ دھول کے یہ ذرات سورج ہی کی مختلف شعاعوں کے ذریعہ سورج سے زمین پر وارد ہوتے ہیں۔ ایک سائنسی تحقیق کے مطابق سورج سے ہر سال زمین پر آنے والے دھول کے ذرات کا مجموعی وزن چونسٹھ کروڑ ٹن ہوتا ہے۔

مولانائے روم کا یہ نظریۂ وجود مکمل طور پر قرآنی آیات سے ماخوذ ہے ملاحظہ فرمایئے:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ. (البقرة:29)

وہی ہے جس نے تمھارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف استوا (قصد) کیا تو ٹھیک سات آسمان بنائے۔

نیز قرآن کی بہت ساری آیات میں پہاڑوں کی ضرورت کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے کہ ہم نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ وہ لرزنے نہ لگے ملاحظہ فرمایئے درج ذیل آیت:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ. (لقمان:10)

اس نے آسمان بنائے ایسے ستونوں کے بغیر جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں لنگر ڈالے کہ تمھیں لے کر نہ کانپے اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے۔

مذکورہ آیت میں لنگر سے مراد پہاڑ ہیں۔ قرآن میں قیامت کے ذکر میں ہے:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا . (الزلزال:1)

جب زمین تھرتھرا دی جائے جیسا کہ اس کا تھرتھرانا ٹھہرا ہے۔

اور زمین کے تھرتھرانے کا سبب ہوگا:

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ. (القارعة:5)

اور پہاڑ ہوں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی۔

ان آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ تمام موجودات کسی نہ کسی ضرورت کے سبب عالمِ وجود میں آئے۔ پہاڑوں کا وجود زمین کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین کے طبقات الٹ پلٹ ہو جائیں۔ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور مولانائے روم کے نظریۂ وجود کا اقرار ہمارا جدید علمِ جغرافیہ پیش کر رہا ہے، جس کے مطابق دنیا میں دو پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، ان میں ایک ہے Pacific Ocean Belt اور دوسرا ہے Atlantic Belt۔ یہ دونوں پہاڑی سلسلے ساحلی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایشیا کے جنوب میں پھیلا ہوا ہمالہ پہاڑ، چین منگولیا اور روس کے ساحلی پہاڑی علاقے، یورپ میں مغربی ساحل پر واقع پہاڑ، شمالی و جنوبی امریکہ کے مغربی ساحلوں پر واقع پہاڑ۔ افریقہ کا شمالی ساحل، آسٹریلیا کا شمالی ساحل وغیرہ۔ یہ تمام علاقے پہاڑی ہیں۔ جدید علمِ جغرافیہ کے مطابق براعظموں کے ساحلی علاقے مرکزی علاقوں کی بہ نسبت بہت کمزور ہوتے ہیں اور یہی وہ علاقے ہیں جہاں زمین کے طبقات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، انھیں علاقوں میں دنیا کے 95 رفی صد زلزلے بھی آتے ہیں۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ ایسی صورت حال میں زلزلے کا ایک معمولی سا جھٹکا ان علاقوں کی کیا حالت کرتا اگر پہاڑ نہ ہوتے۔ چنان چہ ثابت ہوا کہ زمین کی تھرتھراہٹ کو رکنے یا کم کرنے کی ضرورت کے تحت پہاڑ عالمِ وجود میں آئے جو نسلِ انسانی کی بقا اور ترقی و ترویج کے لیے لازمی ہیں۔ ان پہاڑوں کا وجود قیامت کے وقت ختم ہو جائے گا کیوں کہ زمین کو اس وقت قرار کی نہیں بلکہ اضطراب کی ضرورت ہوگی۔ چنان چہ یہ بھی ثابت ہوا کہ اس دنیائے آب و گل میں کسی چیز کا وجود اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ اس کی ضرورت ہے۔ ضرورت ختم ہوتے ہی اس شے کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تنازع للبقاء:- دنیا میں تنازع للبقا کا عمل ابتدا سے ہی

جاری و ساری ہے۔ اشیا فنا ہونے کے بعد پھر نشو و نما پاتی ہیں، تمام موجودات خارجی معدوم سے موجود ہوتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

قطرۂ کو در ہوا شد یا کہ ریخت　　از خزینہ قدرتِ تو کے گریخت

(مثنوی معنوی ج 1/ص 208)

یعنی وہ قطرہ جو ہوا میں اڑ گیا یا بہہ گیا، تیری قدرت کے خزانے سے کب بھاگ سکتا ہے؟

مولانا روم یہاں جو مثال پیش کر رہے ہیں اسے جدید علم سائنس میں Water Cycle یا Hydrogen Cycle کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تعجب نہیں کہ جس نظریہ کو جدید سائنس کا نظریہ سمجھا جا رہا ہے وہ نظریہ مسلم حکما و صوفیا کو صدیوں پہلے معلوم تھا۔ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم یہاں Water Cycle کی تفصیل درج کر دیں:

اس کے مطابق سورج کی تپش سے جھیل، جھرنے، ندی، تالاب اور سمندر کا پانی بھاپ بن کر مسلسل اوپر اٹھتا ہے، جہاں اس کے ساتھ مختلف کیمیائی عمل ہوتے ہیں اور وہ بھاپ بادل میں تبدیل ہو کر ہوا کے دوش پر تیرتی پھرتی ہے۔ پھر جہاں ٹھنڈی ہوا، بلند پہاڑ یا گھنے جنگل سے مس ہوتی ہے، پھر پانی بن کر زمین کی طرف آ جاتی ہے اور زمین کے بہاؤ کے مطابق وہ پانی دوبارہ اپنے مخرج کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ یہ عمل مسلسل سال بھر ہوتا رہتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ پانی کا وہ قطرہ جو بھاپ بن کر بہ ظاہر معدوم ہو گیا وہ معدوم نہیں ہے بلکہ موجود ہے، البتہ اس کی شکل تبدیل ہو گئی اور محض شکل تبدیل ہونے سے وہ معدوم نہیں ہو سکتا، اس کو دوبارہ اسی سمندر کی طرف واپس آنا ہے۔ مثال کے لیے مولانا نے صرف پانی کی بات کہی ہے ورنہ کائنات کی ہر شے میں یہی تسلسل ہے، بلکہ پوری کائنات ہی اس عمل سے گزرتی ہے۔ اس عمل کو جدید سائنس کی اصطلاح میں Universal Cycle Proccess کے نام جانا جاتا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق کائنات ایک عظیم دھماکے کے سبب (جسے Big Bang کہتے ہیں) عالمِ وجود میں آئی۔ دھماکے کے سبب خارج ہونے والے عناصر اپنے مرکز کی مخالف سمت میں رواں دواں رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ مرکز سے 12.5 نوری سال کے فاصلے پر پہنچتے ہیں تو ان کی رفتار اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ مرکز انھیں پھر اپنی جانب کھینچنے لگتا ہے۔ یعنی کائنات کا توسیعی عمل کچھ مدت کے لیے رک جاتا ہے اور پھر مخالف عمل شروع ہوتا ہے اور کائنات سکڑنے لگتی ہے اور پھر ایک مرکز پر تمام عناصر یکجا ہو کر Super Dence Body کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد ان میں ایک عظیم دھماکہ ہوتا ہے اور نئی کائنات عالمِ وجود میں آتی ہے۔

(بہ حوالہ General Geography از: سبھاناتھ مشر ص:5)

ڈاکٹر ایلین سنڈیز کے مطابق ہماری کائنات کا عظیم دھماکہ آج سے تقریباً 120 کروڑ سال قبل ہوا تھا، تب سے یہ مسلسل وسعت اختیار کر رہی ہے۔ یہ عمل 290 کروڑ سال تک مزید جاری رہے گا بعد ازاں کائنات سکڑنے لگے گی۔ سکڑنے کا یہ عمل 410 کروڑ سال تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد پھر عظیم دھماکہ (Big Bang) ہوگا۔ (ایضا)

مولانا اس شعر کے ذریعہ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ خواہ کوئی بھی ''موجود'' ہو وہ محض معدوم ہو کر قدرت الٰہیہ سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ کی قدرت دوبارہ اس کے معدوم کو موجود میں تبدیل کر سکتی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں۔

بحر بیشک منتہائے جو یہاست　　منتہائے دستہا دستِ خداست

ہم بدو باشد نہایت سیل ہا　　ہم ازو گیرند مایہ ابر ہا

(مثنوی معنوی ج 4/ص 302)

ہائیڈروجن سائیکل کی مزید وضاحت کے طور پر مولانا کہتے ہیں کہ تمام ہاتھوں کا منتہا آخر خدا کا ہاتھ ہے۔ یقیناً دریاؤں کا آخر سمندر ہے، ابر اسی سے سرمایہ حاصل کرتے ہیں اور اسی پر سیلاب کی انتہا ہوتی ہے۔

اسی طرح کائنات میں باہمی تنازع للبقا کا نظام جاری و ساری ہے اور کائنات کا ہر ذرہ دوسرے کو کھانے کے لیے منہ کھولے ہوئے ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

حلق بخشد خاک را لطفِ خدا　　تا خورد خاک آب و روید صد گیا

باز حیواں را بہ بخشد حلق و لب　　تا گیاہش رو خورد اندر طلب

چوں گیاہش خورد و حیواں گشت رفت　　گشت حیواں قمۂ انساں و رفت

باز خاک آمد شد اکالِ بشر　　چوں جدا شد از بشر روح و بصر

(مثنوی معنوی ج 3/ص 17)

یعنی اللہ تعالیٰ کی مہربانی مٹی کو حلق عنایت کرتی ہے، یہاں تک کہ مٹی پانی پیتی ہے اور سیکڑوں گھاس اگاتی ہے۔ پھر (اللہ) حیوان کو حلق اور ہونٹ بخشتا ہے، یہاں تک کہ وہ تلاش کر کے اس گھاس کو کھاتا ہے۔ جب حیوان نے گھاس کھائی اور موٹا ہو گیا تو انسان کا لقمہ بنا اور ختم ہو گیا، پھر مٹی انسان کو نگل جانے والی بنی جب کہ انسان سے روح اور بینائی جدا ہو گئی۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ حیوانات نباتات کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں، پھر حیوانات سے انسان کو غذا حاصل ہوتی ہے اور انسان کے مرنے کے بعد خاک اس کو اپنی خوراک بنا لیتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ماسوائے اللہ تعالیٰ ہر چیزے آکل و ماکول است
ہمچوں آں مرغے کہ قصدِ صید ملخ میکرد و بصید ملخ
مشغول بود و غافل بود از باز گرسنہ کہ از پس قفای او
قصد صید او داشت۔'' (مثنوی معنوی ج 5، ص 81)

یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز کھانے والی اور غذا ہے اس پرند کی طرح جو ٹڈی کے شکار کا ارادہ کرتا ہے اور ٹڈی کے شکار میں مشغول ہوتا ہے اور اس بھوکے باز سے غافل ہوتا ہے جو اس کے پس پشت اس کے شکار کر لینے کا ارادہ کرتا ہے۔

مولانا روم کا یہ فلسفۂ تنازع للبقا جدید سائنس میں Eco System کے نام سے معروف ہے۔ اس سسٹم کا ماحصل بعینہ وہی ہے جس کی طرف مولانا کے اشعار میں اشارہ ہے۔ یہ Eco System صرف یہیں تک نہیں ہے۔ اس کی متعدد باریکیاں اور تفصیلات ہیں، سائنس پڑھنے والے طلبہ ان سے واقف ہوں گے۔ یہاں ہم ان تفصیلات کو پیش نہ کرتے ہوئے مولانائے روم کے ان فلسفیانہ اشعار کا مقصد پیش کر دینا چاہتے ہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ پتے جو حیوانات کی خوراک ہیں ان کو بھی اللہ تعالیٰ خوراک عطا فرماتا ہے۔ گیہوں خود رزق ہے لیکن اگر اس کو رزق میسر نہ آئے تو اس کی پرورش نہ ہو۔ یعنی امکان میں سب چیزیں ایک دوسرے کو فنا کر رہی ہیں اور اس فنا کے سائے میں نظامِ بقا اپنا کام کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر طبیعیاتی جغرافیہ میں ڈیوس کا جو کٹاؤ کا نظریہ ہے وہ بھی اسی نظام کی ایک کڑی ہے۔ ڈیوس (Davis) کے نظریے کے مطابق سطحِ زمین کی بلندیاں مختلف عوامل کے سبب کٹ رہی ہیں، جیسے پہاڑوں سے ابلتے ہوئے چشمے اپنے ساتھ پہاڑ کی مٹی کاٹ کر لاتے ہیں اور پست علاقوں (میدانوں) میں جمع کرتے ہیں، لیکن اس ایک چکر کے پورے ہونے تک دوسرے عوامل پہاڑ کو پھر اتنی ہی مٹی بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور اس سلسلے کے سبب پہاڑ اور میدان دونوں کا وجود سلامت ہے۔

تجاذب اجسام:- وہ نظریۂ فلسفہ جس کی رو سے کائنات کے تمام اجسام، ہر ثابت و سیار، ہر جامد و متحرک شے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اسی تجاذب اجسام اور کشش کے سبب نظامِ کائنات ہے۔ جدید علم سائنس اس نظریہ کو نیوٹن سے منسوب کرتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نیوٹن سے سیکڑوں برس قبل یہ نظریہ مولانا نے اپنی مثنوی کے ذریعہ عام کر دیا تھا۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

ذوق جنس از جنس خود باشد یقیں　　ذوق جزو از کلِ خود باشد ببیں

یا مگر آں قابلِ جنسِ بود　　چوں بدو پیوست جنسِ او شود

ہمچو آب و ناں کہ جنسِ ما نبود　　گشت جنسِ ما و اندر ما فزود

نقشِ جنسیت ندارد آب و ناں　　ز اعتبارِ آخر آں را جنس داں

(مثنوی معنوی ج 1/ص 117)

یعنی جنس کو اپنی جنس سے ذوق ہوتا ہے، دیکھو جزو کا ذوق اپنے کل سے ہوتا ہے، یا شاید وہ چیز اپنی جنس کو قبول کرنے والی ہے، جب اس جنس سے ملے اسی جنس کی ہو جائے۔ جیسے پانی اور روٹی ہماری جنس کا نہ تھا، ہماری جنس کا بن گیا اور ہم میں اضافہ کر دیا۔ پانی اور روٹی جنسیت کی صورت نہیں رکھتے، لیکن انجام کا اعتبار سے ان کو جنس سمجھو۔

مولانا روم کے مطابق در اصل ہر ایک چیز کو اپنی جنس سے ذوق ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس جنس سے بھی ذوق ہوتا ہے جو فی الحال تو ہم جنس نہیں لیکن بعد میں ہم جنس بن جاتی ہے، جیسے روٹی اور پانی۔ یہ دونوں انسانوں کی جنس سے نہیں لیکن انسانی بدن میں داخل ہو کر انسان کا جزو بن جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

نقد و نظر

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے

نام کتاب	:	سال نامہ اہل سنت کی آواز
مرتب	:	سید نجیب حیدر قادری برکاتی
صفحات	:	(٦١٦)
سن اشاعت	:	١٤٣٠ھ / ٢٠٠٩ء
ناشر	:	دار الاشاعت برکاتی، خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ
مبصر	:	ساجد رضا مصباحی

خانوادۂ برکاتیہ کا علمی ترجمان سال نامہ "اہل سنت کی آواز" کا خصوصی شمارہ "اکابر مارہرہ مطہرہ" اس وقت ہمارے مطالعہ کی میز پر ہے۔

اکابر مارہرہ مطہرہ کے حالات پر مشتمل "اہل سنت کی آواز" کے اس خصوصی شمارے کو قسط اول کے بطور پیش کیا گیا ہے جس میں خاندانِ برکات کی مختصر تاریخ، مدینۃ الاولیا بلگرام شریف کی تاریخی حیثیت، اس مقدس سرزمین پر آرام فرما جلیل القدر اولیاے عظام کی گراں قدر علمی، مذہبی اور دعوتی و تبلیغی خدمات، نیز صاحب البرکات سید شاہ برکت اللہ عشقی، اسد العارفین سید شاہ حمزہ عینی، مظہر غوثِ اعظم سید شاہ آلِ مصطفیٰ اچھے میاں قدست اسرارہم کے احوال و کوائف اور فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی گئی ہے، جب کہ خانوادۂ برکاتیہ کے باقی بزرگوں کے حالات اگلے خصوصی شمارے میں پیش کیے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

بنیادی طور پر یہ خصوصی شمارہ سات ابواب میں منقسم ہے، پہلا باب " کاروانِ خاندانِ برکات — مدینہ طیبہ سے دہلی تک" کے عنوان سے ہے جس میں امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ (١٢٧٢ھ - ١٣٤٠ھ) کے دستِ مبارک سے تحریر فرمودہ شجرۂ قادریہ برکاتیہ اور منظوم اردو شجرۂ قادریہ برکاتیہ نیز علامہ عبد الجلیل نامی واسطی بلگرام کا فارسی منظوم نسب نامہ ساحل سہسرامی علیگ کے اردو ترجمے کے ساتھ شاملِ اشاعت ہے۔

اس باب کے لیے خصوصی مقالہ جماعتِ اہل سنت کے مستند و معتمد عالمِ دین حضرت علامہ عبد المبین نعمانی مصباحی نے "خانوادۂ برکاتیہ — حضرت مولا علی سے فاتحِ بلگرام تک" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ انھوں نے ١٠٣ صفحات پر مشتمل اپنے اس طویل مقالے میں شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ (وصال ٤٠ھ) سے لے کر حضرت سید ابو الفرح ثانی کے خلفِ ارشد حضرت سید حسین قدس سرہ تک کے حالات اختصار اور جامعیت کے ساتھ مرتب فرمائے ہیں۔ طوالت کے باوجود مواد کی کثرت اور رواں دواں اسلوب کے سبب قاری کو اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم نے اس پورے مقالے کا دل چسپی اور رغبت کے ساتھ مطالعہ کیا۔

"بلگرام شریف — گہوارۂ اکابر مارہرہ مطہرہ" اس شمارے کا دوسرا باب ہے جس میں بلگرام اور اولیاے بلگرام کی شان میں علامہ سید عبد الجلیل نامی بلگرامی، میر سید محمد شاعر بلگرامی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، شیخ علی بخش ظہیر بلگرامی اور صفیر بلگرامی قدست اسرارہم کی فارسی اور اردو منقبتوں کے علاوہ "گہوارۂ اکابر مارہرہ مطہرہ" کے عنوان سے مولانا غلام جابر شمس مصباحی کا گراں قدر مقالہ شاملِ اشاعت ہے، مولانا نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کے ابتدائی صفحات میں بلگرام شریف کی تاریخی، علمی، ادبی اور روحانی حیثیت، محل وقوع، آب وہوا اور فتحِ بلگرام کے اسباب و محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر حضرت سید محمد صغری، سند المحققین میر عبد الواحد بلگرامی، سید العارفین میر سید لطیف شاہ، حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، خاتم المحدثین حضرت علامہ مرتضیٰ حسین زبیدی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات، خدمات اور فضائل و مناقب کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ جلیل القدر شخصیتیں تصوف و معرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل کی بحر ناپید اکنار تھیں۔ ان قدسی صفات بزرگوں نے تصنیف و تالیف اور شعر و ادب کے میدان میں بھی گراں قدر اثاثے چھوڑے۔ اس سب کے باوجود اس مقالے کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مولانا مصباحی نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کے گراں قدر تحقیقی مقالے کا ایک بڑا حصہ بغیر حوالے کے نقل کر دیا ہے، کہیں کہیں معمولی رد و بدل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی ہے، ادبی دنیا میں اسے قلمی سرقہ کہا جاتا ہے، ایسا لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔

تیسرے باب کو "مارہرہ مطہرہ — جلوہ گاہِ ساداتِ زیدی" کی سرخی دی گئی ہے، جس کے لیے ڈاکٹر افضال برکاتی اٹاوہ کے مقالے کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاندانِ برکات کے دو عظیم بزرگ مقدام العارفین سید شاہ عبد الجلیل قدس سرہ اور سید الراحمین سید شاہ اویس قدس سرہ کی سرگزشت حیات تاج العلما سید محمد میاں قادری کی مشہور تصنیف "اصح التواریخ" کے حوالے سے پیش کی ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے اس مقالے کو معلوماتی ہونے کے باوجود اس خصوصی شمارے کے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ کیوں کہ رفیقِ ملت سید نجیب حیدر قادری برکاتی مدظلہ العالی کے بقول اس خصوصی شمارے کا مقصد یہ بھی ہے کہ "بزرگانِ مارہرہ کی حیات و خدمات جدید قلم کاروں کی کاوشوں کی شکل میں ڈھل کر تاریخ کے ایک روشن باب کی شکل میں محفوظ ہو جائیں۔" لیکن ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ بیان اور طرزِ تحریر زبان و بیان کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام ہے۔ انھوں نے اپنا مضمون یا تو ماخذ سے من و عن نقل کر دیا ہے یا صرف لفظی ترجمے پر اکتفا کیا ہے۔

اس باب میں بھی بالترتیب سید شاہ محمد حمزہ عینی، شاہ جلال بسوی، خرد مارہروی، سید اسماعیل حسن وقار مارہروی، سید محمد اشرف مارہروی اور پدم شری بیکل اتساہی کی دل کش نظمیں قارئین کے ذوقِ لطیف کو تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

چوتھے باب میں الجامعۃ الاشرفیہ کے استاذ مولانا اختر حسین فیضی مصباحی نے سلطان العاشقین صاحب البرکات سید شاہ برکت اللہ عشقی مارہروی کے حالات پر شگفتہ اور سنجیدہ اسلوب میں ایک مبسوط مقالہ قلم بند فرمایا ہے۔ فیضی صاحب کا یہ مقالہ مستند حوالوں سے مزین ہے اور موضوع کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔

حضرت صاحب البرکات رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم و فضل اور سلوک و معرفت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہونے کے ساتھ ایک قادر الکلام اور بلند فکر شاعر بھی تھے۔ آپ نے عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے، آپ کے کلام کا اکثر حصہ تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ آپ عربی و فارسی میں عشقی، جب کہ ہندی میں "پیمی" تخلص فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں مثنوی ریاضِ عشق، دیوانِ عشقی، ترجیع بند اور پیم پرکاش معروف ہیں، جن میں سے آخر الذکر آپ کی ہندی شاعری کا مجموعہ ہے۔ مولانا اختر حسین فیضی نے اپنے اس مقالے میں آپ کی شاعرانہ عظمت، صوفیانہ طرزِ فکر اور آپ کے مجموعہ ہاے کلام پر نہایت دل آویز تبصرہ فرمایا ہے۔

پانچویں باب میں اسد العارفین سید محمد حمزہ عینی مارہروی قدس سرہ کے احوال و کوائف پر مولانا ارشاد احمد ساحل شہسرامی کا مقالہ قارئین کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ ساحل صاحب فکر قلم کار ہیں، ان کی تحریریں، طرزِ فکر معقولی اور اندازِ بیان نپا تلا ہوا کرتا ہے۔ موصوف اپنے علمی و تحقیقی کاموں کی وجہ سے اہلِ علم کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے اس مقالے میں اسد العارفین سید محمد حمزہ عینی قدس سرہ کے خاندانی حالات اور اوصاف و کمالات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کاشف الاستار شریف کے مندرجات کی روشنی میں حضرات صوفیہ پر مستشرقین اور معاندینِ اہلِ سنت کے بے سر و پا اعتراضات اور شبہات کا نہایت علمی و تحقیقی جواب بھی رقم فرمایا ہے، جس سے مقالے کی افادیت دوبالا ہو گئی ہے۔

چھٹے باب میں مظہرِ غوثِ اعظم سید شاہ آلِ احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی قدس سرہ کے فضائل و مناقب پر مشتمل مولانا اسید الحق بدایونی کے مقالے کو جگہ دی گئی ہے۔ مولانا بدایونی کا مقالہ ان کی شخصیت عرفی کے شایانِ شان ہے۔

آخری باب یعنی حصۂ نظم خاصا وقیع ہے۔ کاشف الاستار شریف کے منتخب فارسی منظومات کے علاوہ عقیدت و محبت سے لبریز شعراے گلشن برکات کی ٢٩ر منقبتیں بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ قدیم و جدید کے انتخاب کے اس امتزاج نے حصۂ نظم کو بھی دستاویزی صورت دے دی ہے۔

شمارے کے ابتدائی صفحات میں مدیر با تدبیر رفیقِ ملت سید نجیب حیدر حسن میاں دام ظلہ اور معاون مدیر ساحل شہسرامی مصباحی کے مختصر مگر فکر انگیز اداریے ہیں۔ مولانا ساحل شہسرامی نے اس خصوصی شمارے کی ترتیب و تہذیب میں بڑی محنت سے کام لیا ہے، انھوں نے فارسی اور عربی نظموں کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کر دیا ہے، جس کی وجہ سے عام قارئین کے لیے بھی استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

کمپوزنگ کی غلطیوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو کتابت اور طباعت عمدہ اور معیاری ہے، سرورق اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا حسین نمونہ ہے۔ یقیناً یہ خصوصی شمارہ اصحابِ ذوق خصوصاً وابستگانِ خانقاہِ برکاتیہ کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے، رفیقِ ملت دام ظلہ کے بقول: "اندھیری رات میں کبھی کبھی ایک چھوٹا سا چراغ بھی منزل تک پہنچانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ یہاں تو ہم نے آپ کے سامنے اہلِ سنت کی آواز کے افق پر شریعت و طریقت کے آفتاب و ماہ تاب سجا کر پیش کر دیے ہیں۔" ☆☆☆

منظومات

سنگ دل موم بن کر پگھلتے رہے

غم زمانے کے خوشیوں میں ڈھلتے رہے
آپ کے ذکر سے دل بہلتے رہے
ہم تو کرتے رہے ذکرِ خیر الوریٰ
جلنے والوں کو جلنا تھا جلتے رہے
غم میں امت کے رحمت بھری آنکھ سے
اشک بہہ کر دعاؤں میں ڈھلتے رہے
حسنِ اخلاق کی شبنمی آنچ سے
سنگ دل موم بن کر پگھلتے رہے
اختیارِ نبوت کی تصدیق میں
چاند سورج اشاروں پہ چلتے رہے
ہو پسینہ کہ آبِ دہن آپ کا
جاں نثار اپنے چہروں پہ ملتے رہے
استقامت انھیں حق پہ ہو کس طرح
فکر کے زاویے جو بدلتے رہے
میں شکیل ان کی یادوں میں کھویا رہا
دل کے جذبات لفظوں میں ڈھلتے رہے

ڈاکٹر شکیل اعظمی

آمنہ کا چاند چمکا اور اجالا ہو گیا

راز اُس نورِ مجسم کا ہویدا ہو گیا
آفتاب اسلام کا چمکا سویرا ہو گیا
مرتبہ اُس کا فرشتوں سے بھی اونچا ہو گیا
جو کہ اک ادنیٰ غلامِ شاہِ بطحا ہو گیا
کفر کی تاریکیوں میں تھا نہاں سارا جہاں
"آمنہ کا چاند چمکا اور اجالا ہو گیا"
کیا کہوں میں تم سے اے دل عظمتِ پائے رسول
ذرہ ذرہ نقشِ پا کا رشکِ سینا ہو گیا
رونقِ عرشِ بریں پھر زینتِ فرشِ زمیں
یہ مقامِ عبدیت لمحے میں کیا کیا ہو گیا
فخر ہے آفاقؔ ہم ہیں امتِ فخرِ جہاں
جن سے بخشش کا ہماری رب سے وعدہ ہو گیا

ڈاکٹر آفاق فاخری

خیالِ ہجر بھی جس کا وصال جیسا ہو

حسیں تو آمنہ بی بی کے لال جیسا ہو
بدن ہو چاند تو ابرو ہلال جیسا ہو
کوئی کہیں بھی دکھا دے بھرے زمانے میں
کسی کا چاہنے والا بلال جیسا ہو
وہ پاس ہوں تو گزر جائے سال لمحوں میں
رہیں جو دور تو لمحہ بھی سال جیسا ہو
میں اُس کے قرب کیا کیا لذتیں بیان کروں
خیالِ ہجر بھی جس کا وصال جیسا ہو
میں اُس نگاہ کو اپنی طرح کہوں کیسے
کہ جس کے سامنے ماضی بھی حال جیسا ہو
نبی سے مانگ رہے ہو پر اتنا دھیان رہے
تمہارا دستِ طلب بھی سوال جیسا ہو
خیال و فکر میں سرکار کے تئیں قسمتؔ
کبھی فتور نہ شیشے میں بال جیسا ہو

قسمت سکندرپوری

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

پاتے ہیں ضیا آپ سے خورشید و قمر بھی — چمکے ہیں اِسی نور سے تارے بھی، گہر بھی
تابندہ ہوئی کاہکشاں قدموں میں آکر — روشن مرے آقا کی تو ہے گردِ سفر بھی
پہنچے جو سرِ عرشِ بریں حامیِ امت — تھی بخشش امت کی لگن پیشِ نظر بھی
ہم یادِ نبی کا جو شجر بوتے ہیں دل میں — ملتا ہے ہمیں ان کی محبت کا ثمر بھی
چھلکے ہیں جو آنکھوں سے مری ہجرِ نبی میں — وہ اشک بجھا دیں گے جہنم کے شرر بھی
مانگی گئیں جو اُن کے وسیلے سے دعائیں — اُن ساری دعاؤں پہ کھلا بابِ اثر بھی
آئے تھے ارادہ لیے جو قتلِ نبی کا — پڑتے ہی نظر ہو گئے شیدا وہ عمر بھی
فیضانِ کرم سے ہوئے سیراب دو عالم — ہو لطف و کرم سرورِ کونین اِدھر بھی
اکتا گیا دل شامِ الم دیکھ کے رعناؔ — اے کاش کہ دیکھوں کبھی طیبہ کی سحر بھی

رعنا مظہری دہلوی

یہ ہے میرا وطن

مبارک پور کا ایک ادبی سیمینار

مبارک حسین مصباحی

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کا ایک صنعتی اور علمی قصبہ ہے، اس کی دونوں حیثیتیں مختلف ہیں، لیکن شہرۂ آفاق اور باہم معاون و مددگار ہیں۔ "بنارسی ساڑیاں" ہمارے ملک کی بڑی مشہور اور دل کش صنعت ہے۔ بنارسی ساڑی کے نام سے ریشمی ساڑی کی صنعت میں مبارک پور ملک بھر میں مشہور ہے۔ مبارک پور کی یہ صنعت ۹۹ رفی صد مسلمانوں سے وابستہ ہے، اس لیے حکومت کی بے توجہی کا شکار ہو گئی ہے۔ چند سال قبل تک دور دراز کے کاری گر اور مزدور ہندوستان کا دبئ سمجھ کر مبارک پور آتے تھے، مگر اب مبارک پوری نوجوان ملازمت اور معیشت کی تلاش میں ملک اور بیرون ملک جانے پر مجبور ہیں۔ انسان اپنے اہل و عیال سے سخت مجبوری ہی کی وجہ سے جدائی اختیار کرتا ہے۔ اس پس منظر میں کسی شاعر نے بڑی لگتی ہوئی بات کہی ہے۔

اٹھو کاندھے سے، آنسو پونچھ ڈالو — وہ دیکھو ریل گاڑی آگئی ہے
تمھیں میں چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا — غریبی مجھ کو لے کر جارہی ہے

مبارک پور میں مختلف افکار و عقائد کے لوگ رہتے ہیں، دیوبندی، وہابی، بوہرے، اہلِ تشیع، ان کے ادارے، علما اور اہلِ شعر و ادب بھی ہیں۔ مگر قیادت و پیشوائی اہلِ سنت و جماعت کو حاصل ہے۔ قصبے میں اہلِ سنت کی درجنوں انجمنیں ہیں، اکابر علما اور بلند پایہ اہلِ شعر و ادب بھی ہیں۔ دینی جلسے، نعتیہ محفلیں اور ادبی مشاعرے بھی خوب ہوتے ہیں، سامعین بھی تربیت یافتہ ہیں، عام لوگ بھی پاکیزہ ذوق اور حالات پر نظر رکھتے ہیں۔ اردو اخبار اور دینی رسائل کے قارئین کی تعداد بھی حوصلہ افزا ہے۔ دین و ادب کے نام پر سخاوت و فیاضی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ عام سنی آبادیوں کی طرح پیروں کی اندھی عقیدت سے بڑی حد تک محفوظ ہیں اس لیے یہاں مشربی زعم تعصب کی بوالعجبیاں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اہلِ مبارک پور علمائے کرام اور مشائخ عظام کا بے پناہ ادب و احترام کرتے ہیں، خانقاہوں، مدرسوں اور مراکز اہلِ سنت سے قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلیں بڑے ادب و احترام سے منعقد کرتے ہیں، بزرگوں کے اعراس، شادیوں کی رسوم اور اسلامی تقریبات بڑی حد تک شریعتِ مصطفیٰ کی روشنی میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جلالۃ العلم حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ کا عرسِ اسلامی تیوہار کی طرح مناتے ہیں۔ اہلِ مبارک پور مہینوں سے اس کا انتظار کرتے ہیں، نئے نئے کپڑے بناتے ہیں، عرس کے ایام میں گھر گھر مہمانوں کا جم گھٹا رہتا ہے، شعرا چادروں کے نام سے بڑے ذوق و شوق سے مناقبِ حافظ ملت لکھتے ہیں، جنھیں انجمنیں آواز سے آواز ملا کر جلوسِ چادر میں پڑھتی ہیں تو فضا میں وجد و کیف کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ دوروزہ عرسِ عزیزی اہلِ مبارک پور کے لیے خیر و برکت کی بہاریں لے کر آتا ہے۔ اہلِ مبارک پور ملک بھر سے آئے مہمانوں کی ضیافت کا اہتمام بھی بڑی فیاضی اور سلیقہ مندی سے کرتے ہیں۔

جہاں تک مبارک پور کے علمی اور ادبی ماحول کی بات ہے، جس آبادی میں برصغیر کی عظیم علمی اور دینی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ ہو، اس آبادی کی علمی اور ادبی فضا پر گفتگو کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ مبارک پور کے اس علمی کارواں کی سربراہی عزیز ملت حضرت علامہ عبد الحفیظ صاحب فرما رہے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اردو ادب کے حوالے سے خاکِ ہند کی سچائی یہ ہے کہ آج یہاں اردو شعر و ادب کے چہرے کی رونق مدارس کے دم قدم سے ہے۔ مدارس اسلامیہ آج اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے سے کنارہ کش ہو جائیں تو اہلِ اردو کو قارئین اور سامعین چراغِ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔ اردو نے خانقاہوں میں جنم لیا، جب جوان ہوئی تو شراب خانوں کی ہو کر رہ گئی۔ اب نہ وہ صوفیا کے ملفوظات کو گوارا کرتی ہے اور نہ علما کے اسلامی ادب کو، حالاں کہ اردو میں اسلامی لٹریچر جس وسیع پیمانے پر پڑھا جا رہا ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی ادبی لٹریچر کی کھپت نہیں ہے۔ یہی حال غزل کے مقابلے میں نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے، مگر افسوس اردو کے نام پر حکومتی مراعات اور اعزازات کے ایوان میں نہ اسلامی قلم کاروں کی گنجائش ہے اور نہ نعتیانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اسے روزی روٹی سے جوڑ دیا جائے، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی بھی زبان کے فروغ کے لیے دو امکانات ہیں، معاش یا مذہب۔ اردو کے معاشی امکانات تو آزادی کے بعد ہندوستان میں قریب قریب ختم ہی ہو گئے ہیں۔ اردو کے نام پر حکومتیں جو ایڈ جاری کرتی ہیں وہ شاعروں اور ادیبوں کے ایوارڈ اور مشاعروں اور سیمیناروں کی نذر ہو جاتی ہیں، حالاں کہ اگر اس رقم کو اردو کے قاری پیدا کرنے پر صرف کیا جاتا تو کسی حد تک اس مرض میں افاقہ ہو سکتا تھا۔ اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کا مستقبل غیر واضح ہوتا ہے، اس لیے طلبہ اس طرف رخ ہی نہیں کرتے۔ اب لے دے کر مدارسِ اسلامیہ میں اردو پڑھی پڑھائی جا رہی ہے۔ اردو معلمین اور اردو مترجمین کے نام پر جو تقرریاں ہوتی ہیں ان سے اردو کے علاوہ ہر کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ اس زبان کا المیہ ہے جس نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک وطن کی آزادی میں سب سے اہم اور کلیدی کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی میں جو سب سے پہلا صحافی شہید ہوا وہ دہلی کے اردو اخبار کا ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھا۔ مگر آزادی کے بعد اردو کے ساتھ وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو ہندو سماج میں بیواؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہندو سماج میں بیوہ کا چہرا دیکھنا بھی نحوست کی علامت تصور کیا جاتا ہے، مگر محترمہ اندرا گاندھی اور محترمہ سونیا گاندھی جیسی خواتین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اہل سیاست صبح صبح ان کا چہرا دیکھنا اپنی سیاسی ترقیوں کے لیے باعثِ خیر و برکت تصور کرتے ہیں۔

ذکر تھا مبارک پور کے علمی اور ادبی ماحول کا۔ مبارک پور کے الجامعۃ الاشرفیہ سے ایک سے ایک یگانہ روزگار علما اور محققین پیدا ہوئے، اور آج بھی جامعہ اشرفیہ کے احاطے میں نام ور اور بلند پایہ علما اور اربابِ قلم موجود ہیں جو شب و روز دین و دانش اور علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سردست ذکر کریں گے ہم باشندگانِ مبارک پور کا، یہاں کے علما اور اہل شعر و ادب میں بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی، قاضی شریعت مولانا محمد شفیع اعظمی، استاذ القرا قاری محمد یحییٰ اعظمی اور نقاد و ادیب اور صاحبِ فن شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر شرر مصباحی مبارک پوری کے نام آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مرحوم شعرا میں زماں مبارک پوری، فراز مبارک پوری، مضطر مبارک پوری اور فقیر اللہ اسد سیمابی کے نام شاعری کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، مگر افسوس اہلِ مبارک پور ان نقوش رفتگاں کو اب آہستہ آہستہ بھلاتے جا رہے ہیں۔ ان سخن ورانِ مبارک پوری کی لو سے لو ملا کر آج مبارک پور میں جو ادبی اور شعری چراغ روشن ہیں، ان میں: عزیز برقی، مولانا محمد خلیل گوہر، مولانا ممتاز مصباحی مبارک پوری حالیہ مقیم برطانیہ استاذ الشعرا ماسٹر مظہر مبارک پوری، مولانا قمر الزماں مبارک پوری، شاہد مبارک پوری، حاجی محمد یونس مبارک پوری، بشر مبارک پوری، ماسٹر قیصر جاوید اور مہتاب پیامی کے نام بھی علم و ادب کے حوالے سے بڑی اہمیت اور قدر و منزلت کے حامل ہیں۔ مولانا نعیم اختر مبارک پوری اور جناب ڈاکٹر قمر الہدیٰ مبارک پوری بھی شعر و ادب کا جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب اللہ انصاری بھی مبارک پور کے اربابِ قلم کی فہرست میں شامل ہیں۔ حالیہ اساتذۂ اشرفیہ کی فہرست میں مولانا اعجاز مبارک پوری اور مولانا قاری نور الحق مبارک پوری کے وجود بھی غنیمت ہیں۔ ان میں پہلے اصولی اور دوسرے صوفی ہیں۔ مولانا محمد محبوب عزیزی ماہ نامہ اشرفیہ سے وابستہ ہیں اور دعوت اسلامی کے مبلغ کی حیثیت سے متعارف ہیں۔

علم و ادب کے قدر دانوں میں ڈاکٹر شمیم احمد مبارک پوری اور جامعہ اشرفیہ کے ناظم اعلیٰ الحاج سرفراز احمد کے نام قابلِ ذکر ہی نہیں بلکہ اگر ان کا ذکر نہ کیا جائے تو دبستانِ مبارک پور میں ایک غیر معمولی خلا رہ جائے گا۔ جامعہ اشرفیہ اور اس کے شعبوں کی تعمیر و ترقی میں حاجی سرفراز کا نام تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ڈاکٹر شمیم احمد چیر مین نگر پالیکا مبارک پور بھی اہل مبارک پور کے تعلیمی اور ادبی فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مبارک پور گرلس ڈگری کالج کے بانی کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مگر یہ تاریخ زماں ساڑی ہاؤس کے مالک حاجی محمد اشہد کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب گاہے گاہے علمی اور ادبی فروغ کے لیے یوم اقبال اور یوم غالب وغیرہ کا بھی انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ سال بہ سال مبارک پوری طلبہ و طالبات کو انعامات اور اعزازات سے نوازتے رہتے ہیں۔ امسال ڈاکٹر صاحب نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے نگر پالیکا میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا، جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اکیڈمی کی چیر پرسن ترنم عقیل کو مدعو کیا۔ اس سیمینار میں نہ جانے کیوں ڈاکٹر صاحب نے ہماری بیس سالہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں ہمیں ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا تذکرہ ہم نے اس لیے کر دیا تاکہ یہ سلسلہ وہ آئندہ دیگر اہل علم و ادب کے لیے بھی جاری رکھیں۔

اس سے پہلے ۲۵؍ جولائی ۲۰۰۹ء کو خانقاہ حبیبیہ دین نگر پور مراد آباد نے خلیفۂ مجاہد ملت مفتی شاہ عبد الرب علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر ہمیں "مجاہد ملت ایوارڈ" دیا، اس کے بعد ۳؍ جنوری ۲۰۱۰ء کو مائینارٹیز ایجو کیشنل اینڈ سوشل ڈیولپمنٹ کان پور نے قومی خدمات کے اعتراف میں "حافظ ملت ایوارڈ" سے نوازا۔ کملیشورم گیسٹ ہاؤس کان پور میں "مسلم مسائل" کے حوالے سے منعقد ہونے والے اس سیمینار

کے مہمانانِ خصوصی پیر طریقت شعیب العلیم بقائی، قاضی شہر کان پور مولانا عالم رضا برکاتی۔ مرکزی وزیر شری پرکاش جیسوال، ایم. پی. ظفر علی نقوی اور جناب اخلیش شکل دہلوی تھے، جب کہ سیمینار کے داعی ہر دل عزیز نوجوان دل نواز خان تھے۔ اس سب کے باوجود صدارت کی کرسی مجھ ہیچ مداں کو سونپ دی گئی تھی۔

مبارک پور کے سیمینار کا عنوان تھا "جنگ آزادی میں اردو ادب کا کردار" سیمینار کی رپورٹ جناب فراز ادیبی صاحب نے تحریر کی تھی جو ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی۔ ہم اسے یہاں بھی شامل کیے لیتے ہیں تاکہ آئندہ نسلوں کے لیے سند رہے۔

فروری ۲۰۱۰ء کو اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے مبارک پور نگر پالیکا میں بعنوان "جنگ آزادی میں اردو ادب کا کردار" عظیم الشان سیمینار ہوا مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اردو اکادمی کی چیئرپرسن محترمہ ترنم عقیل نے کہا کہ ملک کی آزادی میں اردو نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس کے صرف ایک نعرے انقلاب زندہ باد نے لوگوں میں ایسا جوش بھر دیا کہ انھوں نے انگریزوں کی ناقابل تسخیر حکومت کو سات سمندر پار اٹھا کر پھینک دیا۔ لیکن یہ بھی ایک المیہ ہے کہ آزادی کی نقیب اردو زبان فرقہ پرستی کا شکار ہو کر تنزلی کی طرف گامزن ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس گنگا جمنی زبان کو ایک منظم سازش کے تحت ایک مخصوص فرقہ سے جوڑ دیا گیا تاکہ دوسرے فرقوں کے لوگ اس سے دور ہو جائیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو کی تنزلی کے لئے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں ہم اردو کی ترقی کے لئے واویلا تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کی ترقی کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے اور اب تو ہم اپنے بچوں کو اردو سے دور کر کے فخر محسوس کرتے ہیں کہ میرا بیٹا انگلش داں ہو گیا، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان ہمارے وجود کی پہچان اور تہذیب و تمدن کی ضامن ہے اس لئے کم از کم اپنے وجود کی بقا کے لئے تو ہمیں اردو کی حفاظت کرنی ہی چاہیے، انہوں نے چیئرمین نگر پالیکا ڈاکٹر شمیم احمد کی تعلیمی خدمات اور اردو ادب سے وابستگی کی ستائش کی۔ اس سے قبل چیئرمین ڈاکٹر شمیم احمد نے ترنم عقیل کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ وہ گہوارہ علم و ادب مبارک پور حاضر ہوئیں اس کے لئے مبارک پور کا ہر فرد ان کا ممنون ہے عمار ادیبی نے کہا کہ ہمیں اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے لئے اپنے محسنوں کے نقش قدم پر چلنا پڑیگا، اور اپنے عملی اقدام سے پھر انقلاب زندہ باد کو زندہ کرنا ہو گا، سابق چیئرمین ڈاکٹر عبد الاول راعینی نے کہا کہ آج اردو صرف مدارس کی وجہ سے زندہ ہے، انہوں نے کہا کہ آج دانستہ اردو کو ہندی کے خول میں قید کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شبلی کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شباب الدین نے اپنے خطبہ صدارت میں اردو زبان کی ابتدا عروج و زوال اور ملک کی آزادی میں اس کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس سیمینار کا آغاز اقراء پبلک اسکول کی طالبات نے علامہ اقبال کے ترانہ ہندی سے کیا اس کے بعد ڈاکٹر شکیل احمد مئو، ڈاکٹر نعیم احمد سنگم اعظمی، مہتاب پیامی جامعہ اشرفیہ، فواز رحمانی جے این یو دہلی اور فراز ادیبی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

سیمینار میں معروف ادیب و صحافی مولانا مبارک حسین مصباحی چیف ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کو ان کی صحافتی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے اپنے اعترافیے میں کہا "مولانا مبارک حسین مصباحی صحافت آشنا قلم کار، بلند پایہ مفکر و دانش ور کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں، محبان اردو نے آپ کو فخر صحافت اور نازش فکر و فن کے دل آویز القابات سے نوازا ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے علمی ترجمان ماہ نامہ اشرفیہ نے پوری دنیا میں الجامعۃ الاشرفیہ اور مبارک پور کا نام روشن کیا ہے، ماہ نامہ اشرفیہ کو دنیائے صحافت میں ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ مولانا مبارک حسین مصباحی تقریباً ۲۰ برس سے ماہ نامہ اشرفیہ کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے عہد ادارت میں ماہ نامہ کبھی جمود و تعطل کا شکار نہ ہوا۔ علاوہ ازیں آپ کی درجنوں مطبوعہ کتب نے اہل علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کیا ہے بالخصوص "افتراق بین المسلمین کے اسباب، جہان رئیس القلم اور شہر خموشاں کے چراغ" کو علمی و ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ "افتراق بین المسلمین کے اسباب" تنقیدی تاریخ ہے اور شہر خموشاں کے چراغ خاکہ نگاری کی بہترین مثال ہے۔ "افتراق بین المسلمین کے اسباب" اور اس کے علاوہ چند کتابوں کا انگریزی، گجراتی اور بنگلہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مولانا مبارک حسین مصباحی کے ۳۰۰؍ سے زائد علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی مقالات ہند و پاک کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اب تک سو سے زائد سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ فی الوقت "تنظیم ابنائے اشرفیہ" کے جنرل سکریٹری اور "آل انڈیا مدرسہ کو آرڈینیشن کمیٹی" کے کنوینر کی حیثیت سے ملک و ملت کی خدمت میں مصروف ہیں۔

سیمینار کی نظامت نگر پالیکا کمپیوٹر انچارج عامر فہیم نے کی۔ اس موقع پر ممبران نگر پالیکا سمیت مبارک پور کے اردو نواز حضرات اور مختلف اسکولز اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ پروگرام کا اختتام ناظم پروگرام عامر فہیم کے شکریہ پر ہوا۔ ☆☆☆

صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"- اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی۔

اشعارِ رضا کی توضیح

مدیر محترم.................. سلام مسنون

ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور فروری ۲۰۱۰ء کے شمارے میں مکتوب کے کالم میں "حدائقِ بخشش کے چند توضیح طلب مصرعے" کے عنوان سے ایک مراسلہ نظر سے گزرا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ ناہید انصاری جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی میری تشریحات سے بہت ساری الجھنیں دور ہو گئیں۔ مزید چند اشعارِ رضا کی گتھیاں سلجھانے کی گزارش کی ہے۔ مجھے کیوں بد گمانی ہو کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔"

بہر حال توضیح طلب کرنے والی شخصیت کا نام اور پتہ اصلی ہو یا فرضی، اس سے سروکار نہیں۔ اشعارِ رضا کی علمی و فنی توضیح ہو جائے تو بہتر ہے۔ میں بوقتِ فرصت ان پر غور کروں گا اور بعد از تحقیق اظہارِ خیال کی جرأت کروں گا۔ ویسے میرا اپنا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب کبھی مجھے اعلیٰ حضرت کے کسی شعر میں بظاہر کوئی فنی و لسانی یا معنوی نقص محسوس ہوا، تو بعد از تحقیق مجھے اپنی کوتاہیِ علم و فن کا اعتراف کرنا پڑا اور اعلیٰ حضرت کا شعر بہر طور درست بے غبار ثابت ہوا۔

محترم یا محترمہ ناہید انصاری سے میری گزارش ہے کہ حدائقِ بخشش کے یہ توضیح طلب مصرعے دیگر ماہرینِ شعر و ادب کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ ماہر عروض و قافیہ محب محترم ڈاکٹر شررمصباحی کی خدمت میں ضرور پیش کریں۔ یقیناً وہ ان کا ماہ نامہ جامِ نور دہلی میں برق وشرر کی چشمکوں کو بھول کر سنجیدہ انداز میں معقول فنی حل پیش فرمادیں گے۔

ڈاکٹر شررمصباحی صاحب نے حدائقِ بخشش کے موجودہ نسخے کی تصحیح بھی فرمائی ہے اور ہند و پاک کے جملہ یا بیش تر نسخوں کا تقابلی مطالعہ بھی فرمایا ہے۔

مجھے بے پناہ مسرت ہوئی کہ شررمصباحی صاحب کے علاوہ ایک ایسی باذوق علمی شخصیت بھی ناہید انصاری کی صورت میں موجود ہے جو یہ لکھ کر اپنے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔

"کب تک کہے گی ہائے وہ غنچہ ودلال گل"

یہ مصرعہ بیش تر نسخوں میں اسی طرح چھپا ہے، ہند و پاک کے شارحین نے اسی کے پیشِ نظر شعر کے معانی و مطالب بیان کیے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شررمصباحی کے تصحیح شدہ نسخے میں "غنچہ ودلال گل" کی جگہ ایک غیر معروف لفظ "غنج و دلال گل" ہے، صحیح کیا ہے اور شعر کی توضیح و تشریح کیا ہوگی"۔

کم ہی ایسے خوش نصیب ہوں گے جن کے پیشِ نظر ہند و پاک میں شائع شدہ حدائقِ بخشش کے بیش تر نسخے ہوں گے اور ہند و پاک کے شارحین کی توضیحات و تشریحات بھی۔

بہر حال اس تعلق سے میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ شررمصباحی صاحب نے جو غیر معروف لفظ "غنج و دلال گل" لکھا ہے، میری دانست میں صحیح ہے، دیگر شارحین نے کیا تشریح فرمائی ہے، مجھے علم نہیں، جو تشریح فی الفور ذہن میں آرہی ہے وہ یہ ہے:

بلبل حرم کو چل غمِ فانی سے فائدہ
کب تک کہے گی ہائے وہ غنج ودلالِ گل

اے بلبل (عاشق) حرم (گلزارِ طیبہ) کو چل۔ فنا ہو جانے والی شے کا غم کرنے سے کیا فائدہ؟ تو کب تک فانی گل (معشوق) کے غنج (ناز و ادا) اور دلال (عشوہ و غمزہ) کو یاد کر کے ہائے ہائے کہتی رہے گی۔

گل زارِ طیبہ میں پہنچ کر اس گل خوبی کی مدح و ثنا میں مشغول ہو جا جو کبھی فنا اور پژمردہ ہونے والا نہیں۔ اس گل کی ثناخوانی میں تجھے وہ کیف و سرور حاصل ہوگا جو ہمیشہ باقی رہے گا، کبھی ختم نہ ہوگا۔

اس تناظر میں مجھے اپنی نعت پاک کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

جس کی خوشبو کم ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی کبھی
وہ گل باغِ رسالت ہے، مہکتا جائے ہے

عشق و محبت کے لائق تو بس وہی گلِ تر ہے جس کی شان میں امامِ عشق و محبت نے فرمایا ہے۔

بہ ادب جھکالو سر ولا کہ میں نام لوں گل و باغ کا
گلِ تر محمدِ مصطفیٰ چمن ان کا پاک دیار ہے

والسلام ——— شکیل اعظمی، بڑا گاؤں، گھوسی، مئو

رباعی کے اوزان

محترم مدیرِ اعلیٰ ماہ نامہ اشرفیہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں مگر قابلِ افسوس ضرور ہے کہ ہر اردو شاعر نے اس طرف سے اغماض کیا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ رودکی نے رباعی کے ۲۴؍ اوزان متعین کیے تھے اور ایک رباعی میں ان میں سے کوئی بھی چار اوزان استعمال کیے جاسکتے ہیں، لیکن رواں چار چھ ہی ہیں، اس لیے رباعی گو شعرا ان کو ہی استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان سب اوزان میں چوں کہ روانی نہیں بلکہ ناموزونیت کا بھی گمان ہوتا ہے اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

حضرت علامہ جامی علیہ الرحمہ اور رباعی گو شاعر شمس الدین فقیر نے یہ بڑا کام کیا تھا کہ ان ۲۴؍ اوزان کو فارسی کی ۶؍ رباعیات میں کھپا دیا تھا۔ یعنی ۶؍ رباعیات کے ۲۴؍ مصرعے الگ الگ اوزان پر تھے۔ اردو میں شاید کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ ایک شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس جانب اردو کے رباعی گو شعرا کو متوجہ بھی کیا تھا مگر نتیجہ کچھ بر آمد نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے؟ اردو میں رباعی گو شعرا ہیں ہی کتنے؟ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے "درسِ بلاغت" میں تحریر فرمایا تھا کہ انھوں نے ۷۵؍ رباعیات میں رباعی کے ۲۴؍ اوزان کو برتا ہے۔ فرق ظاہر ہے، کہاں ۶؍ رباعیات اور کہاں ۷۵؍۔ بہت فاصلہ ہے۔

یہ فقیر حقیر کسی قابل تو نہیں ہے، مگر جب کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی تو مجبور ہو کر اپنی حیثیت سے زیادہ کام کر بیٹھا۔ ۲۴؍ اوزان میں ۶؍ (۳؍ حمدیہ اور ۳؍ نعتیہ) رباعیات آپ کو برائے اشاعت ارسال کر رہا ہوں۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھالایا (میر تقی میرؔ)

کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔ اخلاقی رباعیات بھی کہی ہیں، مگر وہ آپ کو بھیجنے کے بعد کسی کو بھیجوں گا۔

چوں کہ عروضی اوزان کے اندراج میں اغلاط ہونے کا بہت امکان رہتا ہے، اس لیے کمپوز کرا کر استعمال کر رہا ہوں۔ امید ہے مزاجِ گرامی بہ عافیت ہوگا۔ فقط۔ والسلام۔ ——— ڈاکٹر صابر سنبھلی، سنبھل، مراد آباد

نوٹ: ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کی مذکورہ رباعیات اپریل ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہیں۔ مکتوبِ گرامی رباعیات کے بعد موصول ہوا۔

اشرفیہ جیسا رسالہ شاذو نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے

قابلِ صد احترام مبارک حسین مصباحی صاحب-السلام علیکم

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ ماہ نامہ اشرفیہ ایک ہمدم کے توسط سے نظر نواز ہوا۔ الحمد للہ بہت ہی اعلیٰ اور معلومات بھرا رسالہ ہے جو دینی طور سے مکمل رہ نمائی کر رہا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس سے فیض یاب ہونا چاہیے۔ آپ کا رسالہ بہت ہی پسند آیا جو دین کا اعلیٰ ترجمان ہے۔ آج اس دور میں اشرفیہ جیسے رسالے شاذو نادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اللہ رب العزت سے ہم دعا گو ہیں کہ اشرفیہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ فقط۔

انصاری آصف اقبال، دھولیہ، مہاراشٹر

اشرفیہ کا تبصرہ قیمتی ہوگا

گرامی وقار حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب
تسلیمات وافرہ!

مزاجِ عالی! امید کہ قبلہ اچھے ہوں گے۔ اشرفیہ پابندی سے باصرہ نواز ہو رہا ہے اور آپ کی جامع تحریر اور آپ کے بصیرت افروز کلمات ادارت پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ خدا کرے کہ کسی بھی طرح ملک میں اہل سنت کی مضبوط شیرازہ بندی ہو جائے۔ آمین۔

قبلہ! گزشتہ ماہ ۲۶؍ اور ۲۷؍ فروری کو ملیا جگدیش پور، لکھنؤ میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں سے خطاب کے لیے آیا ہوا تھا، وہیں پر برادرِ گرامی حضرت مفتی بدرِ عالم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس دوران میری کتاب "عدد ۷ کی حیرت انگیز دنیا" کے دو نسخے ان کے حوالے کیا تھا۔ امید کہ کتاب مل گئی ہوگی۔ بڑی محنت سے جمع و ترتیب کا کام کیا ہے، ایک نئی جہت پر کچھ سوچ کر مواد اکٹھا کیا ہے، جس کا ذکر میں نے پیش لفظ میں کر دیا ہے، آپ کا تبصرہ میرے لیے بڑا قیمتی ہوگا، پھر مجھے مزید لکھنے کا حوصلہ ملے گا۔ گزارش ہے کہ اشرفیہ میں اس پر اپنا مؤقر تبصرہ لکھ دیں اور آئندہ کے لیے اپنے مفید مشوروں سے نوازیں۔ والسلام

محمد علی قاضی مصباحی، ہبلی، کرناٹک

ناموسِ رسالت کا تحفظ

مکرمی.................. سلام مسنون

۲۰۱۰ء میں دوبارہ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت امت مسلمہ

کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، گستاخانہ خاکے تو انہوں نے پہلے بھی شائع کیے تھے لیکن اب کی بار گستاخانہ خاکے شائع کرنی والے نارویجن اخبار آفتن پوستن کی گستاخ ایڈیٹر خاتون نے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت پر اب کوئی ٹھوس ردِعمل نہیں آئے گا۔ خاکوں کی اشاعت کے بعد چند دنوں میں یہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ اب مسلمانوں کے اندر ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے مر مٹنے والی کوئی بات نہیں رہی، اب کوئی حرمت رسول کا بدلہ لینے نہیں آئے گا کون ہوگا جو نبی کی حرمت پر جان دے؟ مسلمان اب توہین رسالت کے عادی ہو چکے ہیں ان کے ضمیر سے محبت رسول ﷺ غائب ہو چکی ہے ہم پوری دنیا میں مسلمانوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ اس مرتبہ پہلے کی طرح کوئی مضبوط ردعمل نہیں آئے گا۔ اس چیلنج کو دیکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ کفار اس طرح کی مذموم حرکتیں کر کے مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس عامر چیمہ شہید کو بھول گئے ہیں جس کی شہادت نے ثابت کر دیا کہ عزت سے جیے تو جی لیں گے ورنہ جام شہادت پی لیں گے۔ اس سے پہلے بھی ڈنمارک اور دیگر یورپین ممالک میں انتہا پسند مسیحی و یہودی عناصر نے اس طرح کے خاکے اور کارٹون شائع کر کے پوری امت مسلمہ کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی تھی جس پر پاکستان سمیت دنیا بھر میں مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور بڑے بڑے جلوس نکالے۔ یورپی ممالک کی اشیا کا بائیکاٹ کیا گیا لیکن اس کے باوجود خود کو مہذب کہلانے والے یہ عناصر باز نہ آئے اور ایک بار پھر انہوں نے گستاخانہ خاکے جاری کیے ہیں۔ نام نہاد تہذیب کے دعوے دار مغربی معاشرے کے یہ انتہا پسند نہ صرف دنیا میں امن کے دشمن ہیں بلکہ وہ تہذیبوں کے درمیان تصادم کرانے کی بھی سازشوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ گستاخانہ خاکے شائع کر کے انہوں نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن انہیں انسانی حقوق کے تحفظ کا کیا پاس خود ان کی عدالتیں بھی ان کے اس بے شرم فعل کو صحیح قرار دیتی ہیں جس کی ایک بڑی مثال چند عرصہ قبل ڈنمارک کی ایک عدالت کا پیغمبر اسلام کے خلاف گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے اخبار کے خلاف مقدمہ خارج کر دینا ہے۔ عدالت کا اپنے فیصلے میں کہنا تھا کہ اخبار کے ایڈیٹروں کا مقصد یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کو مجرم یا دہشت گرد ثابت کیا جائے۔ عدالت نے کہا کہ ان کارٹونوں نے ملک کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عدالت نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ دہشت گردی کے واقعات اسلام کے نام پر کیے گئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان اس تعلق کو کارٹون کی شکل میں پیش کرنا غیر قانونی نہیں ہے۔ عدالت کے اس ریمارکس کو کیا کہا جائے کیا اسے ایک مہذب معاشرے کی عدالت کہا جا سکتا ہے؟ جہاں ایک غیر اخلاقی اور شرم ناک فعل کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آج امت مسلمہ کو پھر کسی غازی خدا بخش کی ضرورت ہے جو یورپ جیسے نام نہاد مہذب معاشرے کو سبق سکھائے۔ تاریخ کے جھروکوں سے غازی خدا بخش کے کردار کو دیکھا جائے تو ہمیں ۱۹۲۳ء کا ایک سیاہ ترین دن دکھائی دیتا ہے جب لاہور میں راج پال ہندو نے رسوائے زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" شائع کی جس میں حضور اکرم ﷺ کی شان میں بڑی توہین کی گئی تھی جب یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی تو مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، مسلمان زعما نے حکومت سے اس کتاب کی فوری ضبطی اور اس کے ناشر کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا جس پر راج پال کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ لاہور کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ملزم کو چھ ماہ قید کی سزا دی لیکن اس وقت شادی لال جیسا متعصب چیف جسٹس تھا اس کی ایما پر راج پال ملزم کو سزا سے بری کر دیا گیا جس نے مسلمانوں کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

ستمبر ۱۹۲۷ء کو جب ملعون راج پال اپنی دکان پر موجود کاروبار میں مشغول تھا تو مرد مجاہد خدا بخش جو لاہور ہی کا رہنے والا تھا اس خبیث پر تیز دھار دار چاقو سے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا لیکن اس بد بخت نے اس وقت بھاگ کر اپنی جان بچالی۔ غازی خدا بخش کو زیر دفعہ الف تعزیرات ہند گرفتار کر لیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور سی. ایم. بی. او. گلوی کی عدالت میں اس کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ غازی خدا بخش نے اپنی طرف سے وکیل صفائی مقرر کرنے سے انکار کر دیا، راج پال مستغیث نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا: مجھ پر یہ حملہ کتاب رنگیلا رسول کی اشاعت کی وجہ سے کیا گیا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ ملزم خدا بخش اب بھی مجھے جان سے مار دے گا کیونکہ حملہ کے وقت ملزم چلایا تھا: او کافر کے بچے! آج تو میرے ہاتھ آیا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ عدالت کے استفسار پر اس مردِ غازی نے گرج دار آواز میں کہا: میں مسلمان ہوں، ناموسِ رسالت کا تحفظ میرا فرض ہے۔ میں اپنے آقا کی توہین ہر گز برداشت نہیں کر سکتا۔

از: محمد گل فراز مدنی، کراچی، پاکستان

رودادِ چمن

جامعہ اشرفیہ میں جلسۂ سیرت النبی

جامعہ اشرفیہ میں طلبہ کی سرگرم تنظیم "بزمِ مسعودی" کے تحت ایک جلسۂ سیرت النبی ﷺ بنام "آمدِ مصطفیٰ کا پیغام بنی نوعِ انسان کے نام" منعقد ہوا جس میں کثیر تعداد میں علما اور طلبہ نے شرکت کی اور آپ ﷺ کی انسانی فلاح و بہبود سے متعلق سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اسوۂ رسول پر مکمل عمل کرنے کا عہد و پیمان بھی دہرایا۔

اس موقع سے تنظیم ابنائے اشرفیہ کے جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے اسلام کو درپیش مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ عید میلاد النبی ﷺ کے مواقع پر سیرتِ رسول کو معروضی انداز سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ آج عالمی سطح پر سیرتِ رسول پر اعتراضات کیے جا رہے ہیں، آج وقت کا تقاضا ہے کہ سیرتِ رسول ﷺ کے حقیقی نقوش جدید ذرائع ابلاغ سے دنیا کے کناروں تک پہنچائیں۔ آپ نے فرمایا: اہلِ مغرب کو حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ معروضی تحقیق کے ساتھ کرنا چاہیے، کیوں کہ اسلام کے متعلق ایک چھوٹی سی اقلیت کے گھسے پٹے فکر و عمل کو بنیاد بنا کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر افشانی کرنا سراسر ناانصافی ہے۔

بزمِ مسعودی کے صدر مولانا محمد عارف حسین مصباحی شعبۂ تقابلِ ادیان نے رسول اللہ ﷺ کے دنیا میں تشریف لانے کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ محسن انسانیت ﷺ کی تشریف آوری کائنات کی ہر مخلوق کے لیے سراپا رحمت ہے، کیوں کہ آپ کے پیغامِ فکر و عمل میں اقوام و ملل کی تباہی و بربادی کی بجلیاں نہیں بلکہ محبت و آشتی کی نوید اور رافت و رحمت کے گل ہائے رنگا رنگ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ کے دنیا میں مبعوث ہونے کا مقصد سسکتی ہوئی انسانیت کو شرک کی ظلمتوں، ظلم و جور کی آندھیوں، جہالت کے شب دیجور سے نجات دلانا اور عدل و انصاف کی شمع فروزاں کرنا تھا۔

مولانا عبد الصبور کرلاوی نے انگلش زبان میں آمدِ مصطفیٰ ﷺ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے، ہر چہار جانب ظلم و ستم کا دور دورہ تھا، لاقانونیت عام تھی اور انسان اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ ایسے وقت میں حضور ﷺ نے تشریف لا کر انسانیت کو ظلم و جور سے نجات دلا کر احسانِ عظیم فرمایا۔

پروگرام کا افتتاح حافظ محمد طالب رضا بہرایچی کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا اور اختتام جامعہ کے مؤقر استاذ مولانا صدر الوریٰ مصباحی کی دعا پر ہوا۔

اس موقع سے مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا نور احمد مصباحی، مولانا کہف الوریٰ مصباحی، مولانا دستگیر احمد مصباحی کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ نے شرکت کی جس میں بہ اتفاقِ رائے مندرجہ ذیل قرارداد پاس کی گئی۔

① صیہونی حکومت اسرائیل کے ذریعہ مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس کی بے حرمتی، انسانیت کو شرم سار کرنے والی فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ قتل و غارت گری اور اس پر اسلامی ممالک اور حکومت ہند کی خاموشی کی ہم شدید مذمت کرتے ہیں اور ساتھ ہی حکومتِ ہند سے فلسطینی مسلمانوں اور مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

② بریلی فساد میں بے قصور مسلمانوں پر کیے گئے بے جا مقدمات کی اعلیٰ سطحی جانچ کرا کے ان کے مقدمات واپس لیے جائیں اور فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث بی. جے. پی.، بجرنگ دل اور دیگر انتہا پسند تنظیموں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے

③ مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے رنگ ناتھ مشرا کمیشن اور سچر کمیٹی کی رپورٹوں پر جلد از جلد عمل درآمد ہو۔

④ مرکزی وزیر تعلیم کپل سبل کے ذریعہ مدرسہ سینٹرل ایجوکیشن بورڈ کے بل کو ضروری اصلاحات کے ساتھ ایوان میں منظور کرانے کے وعدے کے باوجود اب تک کارروائی نہ کیے جانے پر ہم اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور ساتھ ہی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے بل کو ایوان میں منظور کرانے کی حکومت سے اپیل کرتے ہیں۔

از: بزمِ مسعودی، جامعہ اشرفیہ

کل ہند عظمتِ اولیا کانفرنس لکھنؤ

صوفیاے کرام نے بھوکوں کو کھانا کھلانے اور غریبوں کی داد رسی پر بطور خاص توجہ دی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی خانقاہوں میں لنگر خانے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ صوفیاے کرام زر اندوزی کے بھی شدید مخالف رہے ہیں، بلکہ ان کے پاس جو کچھ آتا تھا اسے غریبوں اور مسکینوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ آج جب کہ پوری دنیا کا ۸۰ فی صد سرمایہ صرف دس ملکوں کے پاس سمٹ کر رہ گیا ہے اور دنیا میں ہر پانچ سکنڈ پر ایک بچہ بھوک کی وجہ سے مر جاتا ہے، ضرورت ہے کہ ملک اور بیرون ملک صوفی تحریک کو فروغ دیا جائے۔ انسانی تاریخ صوفیاے کرام کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جنھوں نے بلا تفریق مذہب و ملت مظلوموں اور کمزوروں کو اپنے سینوں سے لگایا۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے استاد اور ماہنامہ اشرفیہ کے چیف ایڈیٹر مولانا مبارک حسین مصباحی نے مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن اور مینائی ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی درگاہ شاہ مینا کے تحت بارہ دری قیصر باغ میں منعقد عظمت اولیا کانفرنس کو "صوفیاے کرام کا پیغام عالم انسانیت کے نام" عنوان سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ آج ایشیا اور یوروپ کے مفکرین و دانش ور تصوف کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کر رہے ہیں اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آخر ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں صوفیاے کرام کی مقبولیت اور ان کے ہمہ گیر اثرات کی بنیادی وجہ کیا ہے اور انسانوں کا سیلاب ان کی خانقاہوں کی جانب کیوں چلا آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج ہم اپنے جسم کی ضروریات کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں لیکن روح کی ضرورت پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ جبکہ روح کی ضرورت پر توجہ دینے سے گمراہی اور بے دینی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مولانا مصباحی نے کہا، ہندوستان صوفی سنتوں کا ملک ہے، اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ مسلم ریزرویشن کا نظم کر کے غریب اور نادار مسلمانوں کو پر سکون زندگی گزارنے کا حق دے۔ مولانا نے خواتین ریزرویشن بل کو بھی مسلم دشمن بل قرار دیتے ہوئے کہا کہ مسلم قیادت کے خلاف یہ ایک سازش ہے۔ اسلام اس کی اجازت ہر گز نہیں دیتا کہ وہ بے پردہ ہو کر الیکشن لڑیں اور مخلوط ایوانوں میں سیاسی نمائندگی کریں۔ مولانا نے آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی کے کنوینر ہونے کی حیثیت سے سینٹرل مدرسہ بورڈ کی تشکیل کا بھی پر زور مطالبہ کیا۔

پروفیسر غلام یحییٰ انجم ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کا اسلام صوفیاے کرام بالخصوص سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کا مرہون منت ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا یہ عظیم الشان کارنامہ تاریخ کا ایک زریں باب ہے کہ انہوں نے ۹۰ لاکھ سے زائد افراد کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ معروف عربی اسکالر مولانا مقبول احمد مصباحی بانی جامعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نئی دہلی نے امام احمد رضا اور تصوف کے عنوان سے اپنی تقریر میں کہا کہ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی پوری زندگی سنت و شریعت کی اتباع اور بدعت و محرمات سے اجتناب سے عبارت ہے۔

کانفرنس کا آغاز قاری ظفیر احمد رضوی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ نظامت مولانا محشر فریدی الہ آبادی نے کی۔ ہنر پلاموی، اشہر بہرائچی، قاری ارشاد اجمیر، مطلوب منظر نے نعت و منقبت کا نذرانہ پیش کیا۔ کانفرنس کی سرپرستی درگاہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے گدی نشین پیر طریقت علامہ سید مہدی میاں چشتی نے کی۔ صدارت قاری محمد احمد بقائی مہتمم مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن نے کی۔ کانفرنس کے کنوینر پیرزادہ شیخ راشد علی مینائی اور قاری ذاکر علی قادری صدر شعبۂ قرأت مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن کی تحریک پر علما و دانشوروں نے کانفرنس میں چند قراردادیں پیش کیں جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا اور جس کی تائید خانقاہ مینائیہ گونڈہ کے محبوب شاہ مینائی، سید شعیب العلیم بقائی خانقاہ مشہودیہ صفی پور اناؤ، مفتی حبیب اللہ خاں نعیمی بلرامپور، قاری جلال الدین روناہی فیض آباد، مولانا محمد اقبال قادری دارالعلوم وارثیہ گومتی نگر اور قاری رئیس احمد خاں ریاستی جنرل سکریٹری جماعت رضاے مصطفےٰ نے کی۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے استاد مولانا نفیس احمد مصباحی نے قرارداد پڑھ کر سامعین کو سنایا۔ قرارداد میں ہر قسم کی دہشت گردی کی مذمت کی گئی اور دہشت گردی کے خاتمہ کا حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ پونے بم دھماکہ کی مذمت اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسلمانوں کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کانفرنس دہشت گردی پھیلانے والوں کی مذمت

کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم نوجوانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ بیدار رہیں اور کسی ایسی تنظیم یا تحریک میں شامل نہ ہوں جن کا تعلق ملک دشمن سرگرمیوں سے ہو۔ قرارداد کے ذریعہ مرکزی وزیر کپل سبل سے مدرسہ بورڈ کی جلد سے جلد تشکیل کا مطالبہ کیا گیا۔ رنگ ناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات کے مطابق مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کے مطالبہ کے ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ وقف بورڈ بالخصوص خانقاہوں اور درگاہوں سے متعلق وقف بورڈوں میں ایسے افراد کی تقرری کی جائے جو اولیاے کرام سے عقیدت و محبت رکھتے ہوں۔ کانفرنس کے صدر قاری محمد احمد بقائی نے مہمانوں، علما و مشائخ کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر بالخصوص شاہ اعجاز محمد فاروقی عرف شمو میاں، رئیس الحسن صدیقی مینائی، صوفی سید اظہار علی، قاری عبد الحنان فہمی، محمد وسیم پپو، شمشیر علی، رئیس علی مینائی، ذکی بقائی، قاری تبریز عالم، قاری جمیل احمد نظامی، قاری نور محمد اشرفی، قاری عبد الکریم اور صغیر احمد قادری سمیت کثیر تعداد میں مدارس کے اساتذہ، ذمہ داران، ائمہ مساجد، دانش ور اور معززین شہر موجود تھے۔ اختتام صلاۃ و سلام اور سید مہدی میاں چشتی اجمیری کی دعا پر ہوا۔ از: قاری محمد عرفان قادری، استاذ مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ

خانقاہ صمدیہ میں جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آستانہ عالیہ صمدیہ پھپھوند شریف میں سابقہ روایات کے مطابق امسال بھی عید میلاد النبی کی تقریبات عقیدت و محبت کے ساتھ منائی گئیں۔ ربیع الاول شریف کی پہلی تاریخ سے دسویں تاریخ تک روزانہ بعد نمازِ عشا محفل میلاد شریف کا متبرک پروگرام منعقد ہوتا رہا جس میں خاص طور سے امام بوصیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قصیدہ "بردہ شریف" نہایت عشق و محبت کے ماحول میں اجتماعی طور پر پڑھا جاتا، پھر بیانِ ولادت کے بعد صاحب سجادہ کی رقت انگیز دعاؤں پر محفل کا اختتام ہوتا۔

گیارہ ربیع الاول شریف کو بعد نمازِ عشا طرحی نعتیہ مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت صاحب سجادہ پیر طریقت سید اختر میاں قبلہ نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا حامد رضا رفاقتی نے انجام دیے۔ مصرع طرح: "جس خاک کو نسبت ہے مدینے کی زمیں سے" کے تحت متعدد مقامی و بیرونی شعرا نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ خاص طور سے سید منظر پھپھوندوی، سید مظفر چشتی، کمال نفیسی، مفتاح الحسن مفتاح، یاور وارثی، کلیم کانپوری، رونق اٹاوی اور سراج تنویر کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔

گیارہ ربیع الاول کی شام کو حضرت صاحبِ سجادہ کی سرپرستی میں ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد ہوا جس میں مقرر خصوصی کی حیثیت سے خطیبِ عصر حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی اور خطیبِ اہلِ سنت مفتی قاسم براہمی پٹنہ نے شرکت کی۔ مولانا مبارک حسین مصباحی نے نہایت پر مغز اور مدلل خطاب فرمایا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور نعمت کے حصول پر فرحت و مسرت کا اظہار ایک فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں آپ کی آمد کے مبارک موقع پر نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ جشن عید میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا: آج پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اسلام کو ایک دہشت پسند مذہب کی حیثیت سے متعارف کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے اسلام دشمن افراد اگر نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا انصاف کی نگاہوں سے مطالعہ کریں تو وہ بھی اسلام کے نظریۂ عدل و احسان کے برملا اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔

آستانہ عالیہ صمدیہ میں جشن عید میلاد النبی ﷺ کی تقریبات نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔ آستانہ کے شہزادگان بارہ ربیع الاول میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر حضور صاحبِ سجادہ دام ظلہ کا ایک رقت انگیز بیان بھی ہوتا ہے۔ پھر عالم اسلام کی حفاظت کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں۔ محفل کے اختتام کے بعد حاضرین ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ و معانقہ کرتے ہیں اور عید میلاد النبی ﷺ کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ربیع الاول شریف کی بارہویں تاریخ کو حسبِ روایت جلوسِ محمدی صاحبِ سجادہ کی قیادت میں نہایت شان و شوکت سے روانہ ہوا اور مقررہ راستوں سے گزرتا ہوا آستانہ عالیہ پہنچا، پھر سابقہ روایات کے مطابق حضور صاحبِ سجادہ کے دستِ اقدس سے پرچم کشائی ہوئی۔ اس موقع پر مہمانِ خصوصی مولانا مبارک حسین مصباحی اور حضرت مفتی قاسم براہمی نے اپنے گراں قدر تاثرات بھی پیش کیے۔ حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی نے آستانہ عالیہ صمدیہ اور حضور صاحبِ سجادہ کے اخلاص و للہیت اور روحانی معمولات کو دیکھ کر فرمایا کہ مجھے ایسا عشق و عقیدت کا ماحول پہلی بار دیکھنے کو ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آستانہ کے فیضان کو عام کرے۔ انھوں نے حضور اکبر المشائخ علامہ سید اکبر میاں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد میں قائم شدہ تنظیم الاکبر

ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کو سراہتے ہوئے کہا: مجھے اس تنظیم کے اغراض ومقاصد پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس تنظیم سے نئی نسل کو جوڑ کر ان کے دلوں میں اسلامی جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ اخیر میں صلاۃ و سلام اور حضور صاحب سجادہ کی دعاؤں پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

از: محمد ساجد رضا مصباحی، جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف

عرس محسن ملت میں حضرت عزیز ملت کی شرکت

خلیفۂ اعلیٰ حضرت جنگ آزادی کے عظیم رہ نما حضرت علامہ شاہ حامد علی فاروقی علیہ الرحمہ کے عرسِ پاک کے موقع سے ۱۲/ ۱۳/ جنوری ۲۰۱۰ء کو دو روزہ عظیم الشان پروگرام شہزادۂ محسن ملت الحاج محمود علی فاروقی (ریٹائرڈ ڈیشن جج) کی سرپرستی اور نبیرۂ محسن ملت مولانا اکبر علی فاروقی (چیرمین محسن ملت یونانی میڈیکل کالج رائے پور) کی صدارت میں بحسن وخوبی انجام پذیر ہوا۔

۱۲/ جنوری بروز منگل آل انڈیا نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اس موقع سے شہر کی ایک سماجی شخصیت جناب الحاج رمیض اشرف صاحب کو "محسن ملت ایوارڈ" سے نوازا گیا جو پانچ ہزار روپے نقد اور ایک شیلڈ پر مشتمل تھا۔ محسن ملت کی حیات وخدمات کے حوالے سے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل "معارف محسن ملت" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

۱۳/ جنوری بروز بدھ جلسۂ سیرتِ پاک کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شہزادۂ حافظ ملت حضور عزیز ملت حضرت علامہ شاہ عبد الحفیظ صاحب قبلہ سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے شرکت فرمائی۔ علما و مقررین، عمائدین اور معززین شہر نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔ از: ڈاکٹر سید عتیق الرحمٰن

اڑیسہ میں کلیۃ البنات رابعہ بصریہ کا سالانہ اجلاس

۱/ مارچ ۲۰۱۰ء بعد نمازِ عشا بول پاڑہ پلنگھا دوبندہ، کیندرا پاڑہ اڑیسہ میں کلیۃ البنات رابعہ بصریہ کا سالانہ جلسہ بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا، جس میں فقیہ ملت حضرت مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ کی مشہور زمانہ کتاب "انوارِ شریعت" اڑیسہ کی اڑیہ زبان میں چھپوا کر حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی کے مقدس ہاتھوں رسم اجرا کیا گیا اور درج ذیل مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے علما و شعرا نے شرکت فرمائی۔

قاری نعمت اللہ گجی درہ، مولانا طہیر الدین میر برکاتی، مولانا ریاضت حسین ازہری جگت سنگھ پور، مولانا مفتی مشرف رضا مصباحی، دھام نگر، مولانا اختر رضا حبیبی گزرپور، مولانا طاہر رضا شمسی کٹک، عبد الرشید صابری، شریف الدین تیغی جگت سنگھ پور، صابر القادری فیضی سلنگ، اور ان کے علاوہ پچاس سے زائد مقامی علمائے کرام شریکِ اجلاس ہوئے۔

بعد نمازِ مغرب کٹک کے علمائے اہل سنت کی میٹنگ ہوئی، جس میں کثیر تعداد میں علما اور ائمہ نے شرکت کی جس میں دعوت و تبلیغ کے حوالے سے مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ علمائے کٹک کی خواہش پر تنظیم علمائے اہل سنت کٹک کو حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی نے "تنظیم ابنائے اشرفیہ" مبارک پور کی شاخ تسلیم کرتے ہوئے عملی پیش رفت کے لیے کچھ خطوط پیش کیے۔ علمائے اہل سنت نے بہ اتفاقِ رائے دعوتِ اسلامی کے فروغ پر بھی زور دیا۔

از: محمد فخر الدین رضوی آسی، اڑیسہ

عرس امامین احمدین مجددین، دھلی

۱۴/ فروری ۲۰۱۰ء اردو پارک جامع مسجد دہلی میں عرس امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی علیہ الرحمۃ والرضوان و عرس اعلیٰ حضرت امام اہل سنت امام احمد رضا قادری محدث بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان منعقد ہوا، جس کی سرپرستی وصدارت مفتی محمد میاں صاحب ثمر دہلوی نقش بندی نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض قاری محمد میاں مظہری ایڈیٹر روزنامہ سیکولر قیادت نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز قاری نوشاد کی تلاوتِ قرآن حکیم سے ہوا، بعد ازاں قاری محمد میاں مظہری اور مولانا فروغ احمد نے بارگاہِ رسالت میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

بانیِ عرسِ مجددین وصدر اجلاس مفتی محمد میاں ثمر دہلوی نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ مجدد ہر عالمِ دین نہیں ہو سکتا، مجدد کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے، اس کا علم، شریعت کے اصول وفروع کا جامع ہوتا ہے، زمانہ کے انقلاب اور نشیب وفراز پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔

خصوصی مقرر کے طور پر مولانا مبارک حسین مصباحی، مولانا عبد المقتدر جالوی، مولانا طاہر حسین مصباحی اور مفتی اختر حسین علیمی نے شرکت کی۔

صلاۃ وسلام اور حضرت مفتی اعظم دہلی کی دعا پر شب کے چار بجے محفل کا اختتام ہوا۔ از: انجمن اہل سنت فلاح دارین، دہلی